ٹیکس نظام کا سماجی جائزہ

محمود مرزا

مصنف کے بارے میں

محمود مرزا نے 1932 میں ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی، بی کام اور ایل ایل بی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اپنایا اور تقریباً 46 سال کارپوریٹ ٹیکس قوانین کی وکالت سے وابستہ رہے۔

سیاسی اقتصادیات، اقتصادی نظاموں کا تقابلی مطالعہ، اسلام کے معروف معاشی و سیاسی نظریات،، ترقی پذیر ممالک کے ٹیکس اور معاشی مسائل اور مستقبلیات ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کی رائے میں پسماندہ معاشروں میں عوام کے جذبات سے کھیلنے والے لیڈروں، بالادست طبقات اور سخت گیر ریاستی نظام سے آزادی آسان نہیں۔ لیکن اس آزادی کے بغیر معاشی انصاف بھی ممکن نہیں معاشرتی ترقی کیلئے جدید علوم وفنون کو فروغ دینا ہوگا، معاشی جدیدیت اختیار کرنا ہوگی، تب ہی ہمارا معاشرتی ماحول ترقی اور انصاف کیلئے سازگار بنے گا۔

قومی شعور کی سطح کو بلند کرنے کے عمل میں شریک ہونے کی خواہش کے تحت اخبارات میں لکھتے رہے۔ چار کتابیں بھی تصنیف کی ہیں:

پاکستان کی معیشت وسیاست، سٹریٹیجی کے تقاضے (1979)

آج کا سندھ (1986)

مسلم ریاست جدید کیسے بنے (2005)

ٹیکس نظام کا سماجی جائزہ (2009)

TAAP
TRUST FOR HISTORY ART & ARCHITECTURE OF PAKISTAN
PUBLICATIONS

ٹیکس نظام کا سماجی جائزہ

محمود مرزا

THAAP
TRUST FOR HISTORY ART & ARCHITECTURE OF PAKISTAN
PUBLICATIONS

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں)

نام کتاب	:	ٹیکس نظام کا سماجی جائزہ
مصنف	:	محمود مرزا
پبلشر	:	ThaaP Publications
اہتمام	:	ESNA Services 0333-4769230
سرورق	:	لالہ رخ
پرنٹرز	:	شاہ محمد پرنٹرز، لاہور
اشاعت اوّل	:	جون 2009
قیمت	:	-/160 روپے

THAAP PUBLICATIONS TRUST FOR HISTORY ART & ARCHITECTURE OF PAKISTAN
43 G-Gulberg III, Lahore
Tel: 042-5880822, Fax 042-5725739,
email:thaappublications@gmail.com

انتساب

جمہوری تحریک کے نام

جو

معاشی انصاف اور ترقی کے لیے ہو

فہرست

○	پیش لفظ	7
1۔	تعارفی حقائق	9
2۔	ٹیکس گریزی کا کلچر	21
3۔	ٹیکس نظام کے مراعات یافتہ طبقات	35
4۔	پرچون فروشوں کا مسئلہ	49
5۔	ٹیکس کی شرح اور معاشرتی تقاضے	57
6۔	بالواسطہ ٹیکسوں کے حقائق	69
7۔	بے اعتمادی — ایک بڑا مسئلہ	79
8۔	ٹیکس وصولی - بنیادی مسئلے کی نشاندہی	85

پیش لفظ

اس کتاب میں رائج ٹیکس نظام کا سماجی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ سماجی اور ریاستی طاقت کی حامل قوتوں نے ٹیکسوں کے حربے سے معیشت اور معاشرے کو کیا رُخ دیا، کن مقاصد اور مفادات کی تکمیل کی اور قوم کو کہاں لا کھڑا کیا۔

آج کسی ملک کی معاشی ترقی اور خوشحالی کا دارومدار اس امر پر ہے کہ اس کی اشیاء اور معاشی خدمات (Services) لاگت اور معیار کے اعتبار سے غیرملکی اشیاء اور خدمات سے مسابقت کے کس قدر قابل ہیں۔ اب ممکن نہیں رہا کہ انتظامی کنٹرول کے ذریعہ یا امپورٹ ڈیوٹی کی دیوار کھڑی کر کے ہم اپنی معیشت کو عالمی مسابقت سے بچا سکیں۔ قوانین کی حد تک ہمارے ٹیکس اور تجارت کے قواعد نئے عالمی تقاضوں کے مطابق ڈھل چکے ہیں۔ یہ کام پروفیشنل ماہرین کے کرنے کا تھا جو انہوں نے کر دیا۔ مگر عالمی نظام ہمارا استحصال کر رہا ہے اور کرتا رہے گا جب تک کہ اس کا نظم ونسق منصفانہ نہ ہو یا پھر ہم اپنے یہاں معاشی عمل جدید خطوط پر استوار نہ کر لیں۔ آج کے دور میں معاشی عمل کی اساس جدید علوم اور ٹیکنالوجی ہوا کرتی ہے۔ جدیدیت کے فروغ کا کام اُس طبقہ کے کرنے کا تھا جو ریاستی طاقت کا مالک

تھا۔ یہ طبقہ اپنے فریضہ میں ناکام رہا۔ بلکہ اس نے ٹیکس چھپایا، مراعات حاصل کیں اور ٹیکس قواعد میں چور دروازے کھولے۔ دوسری جانب ہماری معیشت کی دستاویزیت خستہ حال ہے۔ ٹیکس ادا کرنے والوں کی بڑی تعداد حسابات میں ہیرا پھیری کر کے ٹیکس کے گوشواروں میں غلط بیانی کرتی ہے۔ نتیجتاً دولت مند طبقہ سے ٹیکس وصولی گنجائش سے بہت کم ہوتی ہے۔ ان حالات میں ٹیکس کا بوجھ اشیاء اور سروسز پر ڈال کر عام صارفین، غریب عوام اور متوسط طبقہ پر لاد دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں یہ معاملات زیرِ غور آئے ہیں۔

ہمارے یہاں سیاست، معیشت اور نظامِ تعلیم پر سماجی پسماندگی کا سایہ ہے۔ ٹیکس کا نظام بھی اُن کے بداثرات سے محفوظ نہیں۔ ایک جانب بوسیدہ معاشرہ ٹیکس نظام کو اور دوسری جانب ٹیکس نظام معاشرہ کو پس ماندہ رکھ رہا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب ٹیکس نظام کے سماجی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ اِس نظام میں اصلاح کی تجاویز سماجی تناظر ہی میں پیش کی گئی ہیں۔

موجودہ ٹیکس قوانین اُس آئینی فریم ورک کے مطابق ہیں جو وسط اپریل 2009ء میں رائج ہے۔ ان دنوں آئین کی ترمیم کا چرچا ہے۔ اُمید نہیں کہ آئین میں ایسی کوئی ترمیم ہوگی جو ٹیکس نظام کی طبقاتی نوعیت بدل دے۔

محمود مرزا
mmirza32@hotmail.com
042-5068880

لاہور
20۔ مئی 2009ء

منتقل ہوتی ہے۔ بالواسطہ ٹیکس اشیاء اور سروسز پر عائد ہوتا ہے۔ اس سے اشیاء اور خدمات مہنگی ہو جاتی ہیں اور ٹیکس کا بوجھ صارف پر پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں تاجر یا صنعت کار کا کردار حکومت اور صارف کے درمیان ایک ایجنٹ کا ہوتا ہے جو ٹیکس صارف سے وصول کر کے قومی خزانہ میں جمع کرا دیتا ہے۔ پاکستان میں براہِ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں کا فرق بڑی حد تک مدھم ہو چکا ہے۔ انکم ٹیکس کے قانون کے تحت متعدد مفروضہ ٹیکس وصول کیے جا رہے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالواسطہ ہیں۔ یوں بھی ماہرین کی رائے ہے کہ ٹیکس کوئی بھی ہو (براہِ راست یا بالواسطہ) تاجر یا صنعت کار اسے اپنی قیمت کی ساخت میں شامل کر لیتے ہیں یوں ان کا بوجھ آخرکار صارف ہی برداشت کرتا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا 08-2007ء کے دوران میں انکم ٹیکس کی مد میں کل 389 ارب روپے وصول ہوئے۔ ٹیکس ادا کرنے والے سب افراد محکمہ کے دفتر میں ریٹرن اور سٹیٹمنٹ داخل نہیں کرتے۔ اس لیے ٹیکس ادا کرنے والوں کی تعداد کا شمار ممکن نہیں۔ ٹیکس کا 68 فیصد حصہ 15,000 لمیٹڈ کمپنیوں سے وصول ہوا۔ درحقیقت زیادہ ٹیکس ادا کرنے والی کمپنیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ٹیکس کا بہت بڑا حصہ نیم سرکاری کارپوریشنوں سے حاصل ہوتا ہے، مثلاً فیول پیدا اور تقسیم کرنے والی کمپنیاں جنہیں اپنے شعبہ میں اجارہ داری حاصل ہے۔ بڑی رقم ملٹی نیشنل کمپنیوں سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جن کے کاروبار کا حجم بہت بڑا ہے اور قابلِ ذکر مسابقت کا سامنا نہیں۔ وہ حکومت سے اپنے ڈھب کی پالیسیاں بنوا لیتی ہیں۔ پھر ٹیکسوں کا بڑا حصہ

بڑے بڑے بنکوں سے ملتا ہے جن کی منافع خوری کی نظیر نہیں۔

تنخواہ دار طبقہ کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ انکم ٹیکس کا بیشتر بوجھ وہ اُٹھاتے ہیں۔ حقیقت یہ نہیں۔ یہ طبقہ انکم ٹیکس ریونیو کا صرف 4.1 فیصد حصہ ادا کرتا ہے۔ ان کی تعداد تقریباً 12.5 لاکھ ہے۔ ان میں صرف 2 لاکھ ملازمین نے ریٹرن یا سرٹیفکیٹ داخل کیے۔ دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے سب ٹیکس گزاروں نے انکم ٹیکس کا 28 فیصد ادا کیا۔ ان میں ریٹرن یا سٹیٹمنٹ داخل کرنے والے تقریباً 19 لاکھ تھے۔ مگر کروڑوں کی تعداد میں ٹیکس گزار موجود ہیں جو Withholding انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں مگر کوئی ریٹرن یا سٹیٹمنٹ داخل نہیں کرتے۔ اس کی مثال بجلی کا بل ادا کرنے اور ٹیلی فون کے pre-paid کارڈ خریدنے والے ہیں جو ٹیکس ادا کرتے ہیں مگر ٹیکس گزاروں کی گنتی میں شمار نہیں ہوتے۔ گویا انکم ٹیکس ادا کرنے والوں کی تعداد کم نہیں۔ اصل خرابی انکم ٹیکس ادائیگی میں غلط بیانی اور بالادست طبقات کی مراعات ہیں۔ اس معاملہ پر الگ بحث کی گئی ہے۔

اکنامک سروے 2005-06 کے مطابق ٹیکسوں کا بیشتر بوجھ مینوفیکچرنگ سیکٹر نے اُٹھایا۔ اس شعبے سے وفاقی حکومت کو 62.2 فیصد ریونیو حاصل ہوا، جبکہ اس کی قومی پیداوار سے نسبت 17.9 فیصد تھی۔ زرعی شعبہ کی مجموعی قومی پیداوار سے نسبت 22.5 فیصد تھی لیکن اس کا وفاقی ٹیکسوں میں حصہ صرف 1.2 فیصد تھا جو زرعی مداخلات (inputs) پر عاید انڈائریکٹ ٹیکسوں (امپورٹ ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس) کی صورت میں وصول ہوا۔ ہول سیل اور ریٹیل ٹریڈ کے شعبے کا وفاقی ٹیکسوں میں حصہ

2.8 فیصد تھا جبکہ اس شعبہ کا قومی پیداوار میں حصہ 18.6 فیصد تھا۔

کچھ عرصہ قبل پاکستان میں ٹیکس وصولی کا ایک مقصد دولت کے ارتکاز کو روکنا ہوا کرتا تھا۔ (بعض ترقی یافتہ صنعتی ممالک بالخصوص فلاحی ریاستوں میں یہ اصول آج بھی کارفرما ہے) ہمارے یہاں افراد پر انکم ٹیکس کی بلند ترین شرح 1959ء میں 80 فیصد تھی۔ اس شرح کا اطلاق 70 ہزار روپے کی آمدن پر ہوتا تھا۔ 1965ء میں ٹیکس کی بلند ترین شرح 70 فیصد مقرر ہوئی۔ علاوہ ازیں ایک دولتمند ٹیکس گزار اپنے اثاثوں پر ویلتھ ٹیکس ادا کرتا تھا۔ اس ٹیکس کا جواز یہ تھا کہ ٹیکس گزار نے دولت معاشرتی عمل سے حاصل کی، اس لیے معاشرے کا اس کی جمع شدہ دولت میں حصہ ہونا چاہیے۔ دولت مند کے انتقال کے بعد اس کے ترکہ پر اسٹیٹ ڈیوٹی عائد ہوتی تھی جو اس اصول کا اقرار تھا کہ معاشرے نے اسے دولت اکٹھی کرنے کے مواقع دیے، اس کے ترکہ میں شرکت سے معاشرے کو محروم نہیں کیا جانا چاہیے۔ اسٹیٹ ڈیوٹی کا قانون پاکستان نے انڈیا سے پہلے 1950ء میں نافذ کر دیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے اس قانون پر الزام لگا کر کہ یہ اسلام کے قانونِ وراثت کے خلاف ہے، منسوخ کر دیا۔ منسوخی 1979ء میں عمل میں آئی۔ گویا وہ تسلیم نہ کرتے تھے کہ دولت معاشرتی عمل سے وجود میں آتی ہے۔ مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی نے بہت پہلے زرعی شعبہ پر اس کا اطلاق روک دیا تھا۔ ان تمام قوانین کے ساتھ گفٹ ٹیکس بھی عائد ہوتا تھا جس کا جواز یہ تھا کہ اگر کوئی ٹیکس گزار ویلتھ ٹیکس یا اسٹیٹ ڈیوٹی سے بچنے کے لیے اپنے اثاثے ہبہ کر دے تو وہ کم سے کم گفٹ ٹیکس ادا

کرے۔ اس ٹیکس کو بھی جنرل ضیاء الحق کے دور میں 1985ء میں منسوخ کر دیا گیا۔ کئی مغربی ممالک میں ترکہ پر ٹیکس لاگو ہوتا ہے۔ ترکہ پر اسٹیٹ ڈیوٹی یا کوئی متبادل ٹیکس نافذ کرنے کا جواز اب بھی ہے۔ جہاں تک دوسرے ٹیکسوں کا تعلق ہے، آج کے عالمی مسابقت کے دور میں ٹیکسوں کی بھرمار سرمایہ کاری کو دُور بھگا دے گی۔ چنانچہ ٹیکس کی شرح اونچی رکھنے کی بجائے ٹیکس کی بنیاد (Tax Base) کو وسیع کرنے، معیشت کو ڈاکومنٹ کرنے اور ٹیکس چوری روکنے کی ضرورت زیادہ ہے۔ بلیک اکانومی اور ٹیکس سے مستثنیٰ معیشت کا حجم جتنا کم ہوگا اتنا ہی نظامِ محصولات بہتر ہوگا۔ ٹیکسوں کی وصولی بڑھانے کے لیے ہمیں قومی پیداوار اور معیشت کی پیداواریت بڑھانی چاہیے۔ ٹیکسوں کی وصولی نتیجتاً بڑھ جائے گی۔

صوبائی ٹیکسوں کی مجموعی قومی پیداوار سے نسبت 0.5 فیصد ہے۔ زرعی انکم ٹیکس صرف ایک ارب روپے کے لگ بھگ ہے۔ زرعی ٹیکس کی مجموعی ٹیکس آمدن سے نسبت 0.1% ہے۔ قانون ساز اسمبلیوں کی اکثریت کا تعلق فیوڈل طبقہ، ٹیکس چھپانے والوں اور لینڈ مافیا سے ہے جو صرف ایسے صوبائی ٹیکس نافذ کرتے ہیں جن کا بوجھ شہری آبادی کی مڈل کلاس پر آئے مثلاً پراپرٹی ٹیکس، موٹر وہیکل ٹیکس اور سٹیمپ ڈیوٹی مگر ایسے ٹیکس جو قانون سازوں کے طبقاتی مفاد پر اثر انداز ہوں مثلاً رہائشی پلاٹوں کے کیپٹل گین پر ٹیکس یا حقیقی زرعی انکم ٹیکس ان سے خود کو محفوظ رکھتے ہیں۔ یا پھر وہ ایسی مدات سے ریونیو وصول کرتے ہیں جس کا بوجھ صنعتی شعبہ پر پڑے۔ مثلاً پن بجلی، پٹرول اور گیس۔

حکومت ٹیکسوں کے ذریعہ نظم ونسق چلاتی ہے، امن و امان قائم (کرنے کی کاوش) کرتی ہے، دفاعی افواج کے اخراجات برداشت کرتی ہے، حکومت نے جو قرضے وصول کر رکھے ہوں، ان کا سود اور اقساط ادا کرتی ہے۔ ملک کے صدر اور حکومت کے وزراء، اسمبلیوں کے ارکان کو تنخواہیں، مراعات اور الاؤنس ادا کرتی ہے، عدلیہ، پولیس اور انتظامیہ کا ڈھانچہ برقرار رکھتی ہے۔ 08-2007ء میں وفاق اور صوبائی حکومت کے اخراجاتِ جاریہ کی مجموعی رقم 1832 ارب روپے تھی۔ جبکہ ٹیکس اور غیر ٹیکس ریونیو کی مجموعی آمدن 1545 ارب روپے تھی۔ گویا اخراجاتِ جاریہ مجموعی ریونیو آمدن سے کہیں زیادہ تھے۔ ترقیاتی اخراجات اور فلاحی مقاصد کے لیے ریونیو آمدن میں گنجائش نہ تھی۔ ان شعبوں میں حکومت جو کام کرتی ہے، ان کے لیے قرضے لیتی ہے۔ ان کی ادائیگی کا بوجھ آئندہ کی نسلیں اُٹھائیں گی۔

ٹیکس اکثر ملکوں میں پورا وصول نہیں ہوتا۔ معیشت جس قدر بہتر دستاویزی (documented) ہو ٹیکس وصولی بہتر ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں معیشت کی دستاویزیت بڑی ناقص ہے۔ بہتر وصولی کے لیے محکمہ انکم ٹیکس کے افسران کی تعداد بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ضرورت یہ ہے کہ معیشت کی دستاویزیت کی جائے اور محکمہ کے محاسبہ کا خوف قائم رکھا جائے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ٹیکس گزاروں کی محدود تعداد کا مکمل ٹیکس آڈٹ کیا جاتا ہے اور ہٹ دھرم قصور وار کو قرارِ واقعی سزا دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں کسی اثر و رسوخ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارے یہاں ان اصولوں پر عمل درآمد شروع نہیں ہو سکا۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ

ٹیکس گزار جن پر ٹیکس چوری کا الزام لگا سماجی اور ریاستی طاقت کے مالک بن گئے۔ چنانچہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ٹیکس وصولی کے لیے کوئی ایسا طریقہ وضع کیا جائے کہ ٹیکس گزار سے حساب کتاب کے مطالبہ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ ہماری حکومت نے اس سلسلے میں دو اقدام کیے۔ ایک یہ کہ پیشتر اس کے کہ ٹیکس گزار کوئی رقم یا مال وصول کرے، رقم ادا کرنے یا مال حوالے کرنے والا شخص پیشگی ٹیکس وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرا دے۔ اسے ٹیکس کی زبان میں Withholding ٹیکس کہا جاتا ہے۔ 2009ء میں وفاقی ٹیکسوں کا 52 فیصد حصہ بندرگاہ پر متعین کسٹم کا عملہ درآمدی اشیا کی کلیرنس کے وقت ایڈوانس وصول کر لیتا ہے۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ بعض رقوم اور اشیا کی مالیت کو قانون کی نظر میں آمدن تصور کر کے ٹیکس وصول کر لیا جائے۔ اسے ٹیکس کی زبان میں مفروضہ ٹیکس (Presumptive Tax) کہا جاتا ہے۔ یوں ہمارا انکم ٹیکس کا قانون اس اصول پر قائم نہیں رہا کہ ٹیکس گزار سے ٹیکس اس کی آمدن اور ادا کرنے کی صلاحیت کے مطابق وصول کیا جائے۔

ٹیکس نظام کے اہم پہلو واضح کرنے کے لیے ذیل میں گوشوارے پیش کیے گئے ہیں۔ بھارت کے ساتھ تقابل بتاتا ہے کہ ہمارے ٹیکس نظام کی کارکردگی ناقص ہے۔ یہ نقشے پاکستان اور بھارت کے اکنامک سروے 08-2007ء میں درج اعداد و شمار سے اخذ کیے گئے ہیں۔

Table I

AGGREGATE NATIONAL TAXES

بھارت (2007-08)	پاکستان (2007-08)	
18.8 فیصد	10.1 فیصد	Tax – GDP Ratio (Central & Provincial) مجموعی ٹیکسوں کی قومی پیداوار سے نسبت
12.5 فیصد	9.6 فیصد	مرکزی ٹیکس
6.3 فیصد	0.5 فیصد	صوبائی ٹیکس

ہمارے یہاں صوبائی حکومتیں مجموعی ٹیکس ریونیو کا بہت معمولی حصہ اکٹھا کرتی ہیں جبکہ بھارت کی صوبائی حکومتیں مجموعی ریونیو کا ایک تہائی اکٹھا کرتی ہیں۔ ٹیکس نافذ کرنے کی طاقت ہماری وفاقی حکومت نے اپنے ہاتھ میں مرتکز کر رکھی ہے۔

Table III

BIFURCATION OF CENTRAL DIRECT TAXES

بھارت (2007-08)	پاکستان (2007-08)	
6.5 فیصد	3.7 فیصد	Ratio of Central Direct Taxes to GDP آمدن واثاثوں پر عاید مرکزی ٹیکسوں کی قومی پیداوار سے نسبت
4.0 فیصد	2.5 فیصد	Corporate Tax کمپنیوں پر عاید ٹیکسوں کی قومی پیداوار سے نسبت
2.5 فیصد	1.2 فیصد نوٹ ملاحظہ فرمائیں	Tax Paid by Others دوسرے ٹیکس گذاروں سے وصول ٹیکسوں کی قومی پیداوار سے نسبت

نوٹ: حقیقی شرح 1.2 فیصد سے کم ہے کیونکہ مفروضہ ٹیکس بھی ڈائریکٹ ٹیکس میں شامل ہے۔

بھارتی ریاست کی ڈائریکٹ ٹیکس وصول کرنے کی صلاحیت ہماری نسبت بہتر ہے۔ بھارت کا کارپوریٹ سیکٹر مضبوط اور کارکردگی کے اعتبار سے بہتر ہے۔

بھارت میں ڈائریکٹ ٹیکسوں کی شرح بلند ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ بھارت کی معیشت تیکنیکی اعتبار سے ہمارے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے، بھارتی معیشت کے جدید شعبہ جات مثلاً انجینئرنگ، کیمیکل، سافٹ ویئر، بائیوٹیکنالوجی فروغ پائے ہیں جو ویلیو ایڈیشن کے حامل ہیں۔ اس طرح ٹیکس گزاروں کا خوشحال متوسط طبقہ پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ پاکستان میں ٹیکس ادا کرنے کے قابل طبقہ پایا جاتا ہے مگر اُس کی دولت کی وجہ معیشت کی تیکنیکی ترقی نہیں، غیرقانونی شعبے اور حربے (مثلاً منشیات کا دھندا) ہیں جو ٹیکس کی گرفت سے باہر ہیں۔ کوئی معیشت جرائم سے پاک نہیں ہوتی، فرق ڈگری کا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں یہ ڈگری خوفناک ہے۔

انڈائریکٹ ٹیکسوں کے ضمن میں بھارت کی صوبائی حکومتوں کی سیلز ٹیکس میں کارکردگی اچھی ہے۔ وہاں سیلز ٹیکس صوبے عاید کرتے ہیں، وفاقی حکومت صرف اُس صورت میں سیلز ٹیکس وصول کرتی ہے جب ایک صوبے کی بنی ہوئی شے دوسرے صوبے میں فروخت ہو۔ بھارت کی مرکزی حکومت نے سروسز کے شعبہ سے بہت سا ریونیو اکٹھا کیا ہے۔ اس وقت 100 سروسز پر سروسز ٹیکس نافذ ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں انڈائریکٹ ٹیکس کی قومی پیداوار سے شرح ہمارے مقابلے میں دُگنی ہے۔

ٹیکس گریزی کا کلچر

جو معاشرہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے پسماندہ ہو اور جس کے حکمران طبقات کرپٹ ہوں اُس کی معیشت کی دستاویزیت ناقص ہوگی اور جب ایسا ہوگا تو ٹیکس گریزی کی سطح اونچی ہوگی۔ ہر ملک میں کالے دھن کی معیشت موجود ہوتی ہے۔ معیشت کی دستاویزیت جتنی ناقص ہوگی، کالے دھن کا حجم اتنا بڑا ہوگا۔ پاکستان کے کالے دھن کے حجم کے بارے میں ماہرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حال میں ایک تحقیق کے مطابق کالے دھن کی معیشت کا حجم قومی پیداوار کے 35 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ 08-2007ء میں قومی پیداوار 10 ہزار ارب روپے تھی۔ گویا ٹیکس سے چھپی دولت 3500 ارب روپے تھی۔ ماہرین کے مطابق ہمارے ملک میں جن افراد کے پاس کالے دھن کے ڈھیر لگے ہیں، ان کی تعداد کل آبادی کے ایک فیصد یا زیادہ سے زیادہ 2 فیصد ہے۔ یہ دولت اس کے علاوہ ہے جو ٹیکس سے چھپی ہوئی نہیں۔

2۔ ماہرین نے عام طور پر کالے دھن کے ذرائع میں ٹیکس چوری، غبن، رشوت ستانی، انڈر انوائسنگ، گورنمنٹ کی خریدات اور ٹھیکے، سمگلنگ اور سپیڈ منی بیان کیے

ہیں۔ سپیڈ منی سے مراد ہے رُکے ہوئے کام نکالنے کے لیے دی جانے والی رشوت۔ ہمارے ملک میں منشیات کا دھندا بھی کالے دھن کا بڑا ذریعہ ہے۔ کالے دھن کے اس منبع کو سرکاری اور امریکی خفیہ ایجنسیوں کی اشیر باد حاصل رہی۔ یہ تب ہوا جب افغانستان میں روسی افواج کے خلاف جہاد کرنے والوں کے لیے مالی وسائل کی ضرورت پڑی۔ علاوہ ازیں ہمارے یہاں حکمران ٹولے نے ریاستی اختیارات کے ذریعے اربوں روپے کے وائٹ کالر کرائم کیے۔ ان کی غیرقانونی دولت کا بہت سا حصہ پاکستان سے باہر ہے۔

3۔ ہمارے ملک میں قانونی ذریعہ سے غیرقانونی دولت پیدا ہوئی مثلاً کسی دیانت دار سرکاری ملازم کو سرکاری قاعدہ کے مطابق پلاٹ الاٹ ہوا۔ اُس نے مہنگے داموں فروخت کر دیا مگر دستاویز میں قیمت کم درج کی۔ جو رقم دستاویز سے زائد وصول کی، وہ بلیک اکانومی کا حصہ ہوگئی۔

4۔ کالے دھن کو فروغ دینے میں حکومت کی حکمتِ عملی اور قوانین کا بڑا عمل دخل ہے۔ اس کی ابتدا 1947ء میں ہوگئی تھی جب وفاقی حکومت نے سیاسی مصلحت کے طور پر قبائلی علاقوں کو کسٹم ڈیوٹی اور انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا۔ اس سے قبائلی علاقوں میں کسٹم ڈیوٹی سے معاف اشیا کی مارکیٹ وجود میں آ گئی۔ اگرچہ ان اشیاء کا قبائلی علاقے سے باہر لانا جرم تھا مگر یہ جرم خوب پھلا پھولا اور کرپشن پھیلانے کی ایک وجہ بن گیا۔ متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹ بھی کرپشن کا ذریعہ بنی۔ بہت سے ایسے افراد کو متروکہ جائداد الاٹ ہوئی جو اس کے مستحق نہ تھے۔ اس طرح سے ناجائز

حربوں سے دولت حاصل کرنے کا رویہ قائم ہو گیا۔ پھر جنرل ایوب خان کی حکومت نے درآمدات کو کنٹرول کرنے کے لیے امپورٹ لائسنسوں کا قانون بنایا۔ یہ قانون کالے دھن کا بڑا ذریعہ بن گیا۔ حکومت نے بین الاقوامی لین دین کے لیے اپنے سکے کی قیمت غیر حقیقی طے کر رکھی تھی۔ ایک لاکھ روپے کی درآمدی اشیاء بازار میں تین چار لاکھ کی بک جاتی تھیں۔ امپورٹروں کو بے حساب دولت مل گئی۔ شاید ہی کسی امپورٹر نے اپھل منافع پر پورا انکم ٹیکس ادا کیا۔ پانچ لاکھ کمانے والے نے پچاس ہزار منافع ظاہر کیا۔ محکمہ انکم ٹیکس نے عدم اعتماد کر کے آمدن کی تشخیص ایک لاکھ کر دی۔ چار لاکھ کا منافع چُھپ گیا۔ یوں پاکستانی سکہ کی مارکیٹ میں غیر حقیقی قیمت (Over-valuation) نے بلیک اکانومی اور کرپشن کو بڑھایا۔

5۔ چھٹی دہائی میں حکومت کی یہ سوچی سمجھی پالیسی تھی کہ دولت کا ارتکاز کیا جائے تاکہ صنعت کاری کے لیے سرمایہ اکٹھا ہو۔ سو طرح طرح کی مراعات دی گئیں۔ نئی صنعتوں کی آمدن کو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا، ان کی مصنوعات کو مسابقت سے بچانے کے لیے بیرونی اشیاء کی درآمد پر اونچی امپورٹ ڈیوٹی عاید کی۔ اس سے ایک جانب صنعتکاروں کی دولت بڑھی اور دوسری جانب آسان دولت (Easy Money) کا رجحان پنپا۔ یوں جو صنعتیں قائم ہوئیں، وہ آسان ٹیکنالوجی یا اشیاء اسمبل کرنے کی تھیں۔ اس طرح چند ہاتھوں میں بہت سی دولت مرتکز ہو گئی۔ پیشتر اس کے کہ صنعت کار اسے نسبتاً اونچی ٹیکنالوجی کی صنعتوں کی جانب موڑتے پاکستان نے بہت سے نجی اداروں کو قومیا لیا۔ مشین سازی کی صنعت قومیانے سے زبردست

دھچکا لگا۔ مشین سازی کی صنعت وسطی پنجاب میں فروغ پا رہی تھی۔ لاہور کی پیکو انجینئرنگ کمپنی کو چین اور کوریا اپنے لیے مثال تصور کرتے تھے۔ قومیانے کے نتیجے میں ملک کے اندر ٹیکنالوجی کے فروغ کا راستہ مسدود ہو گیا اور صنعتی ترقی کا انحصار درآمدی مشینری پر قائم ہو گیا۔

6۔ جب ایک بار آسان دولت (Easy Money) کا کلچر پھل پھول جائے تو حصولِ دولت کے لیے سوچ منفی انداز اختیار کر جاتی ہے۔ اس کا ایک اظہار اس صورت میں ہوا کہ دولت مند لوگوں نے صنعت کاری کی بجائے اپنی دولت کا رُخ نمائش کی اشیا، فضول خرچی اور ایسے کاروبار کی طرف موڑ دیا جس میں چیلنج اور قومیائے جانے کا خوف نہ ہو۔

ملک میں موجود کالا دھن جائیدادوں کی خرید و فروخت کی جانب متوجہ ہو گیا۔ حکمران طبقات بھی جائیدادوں کی خرید و فروخت کے کاروبار میں شریک ہو گئے۔ اس کاروبار کی جانب سے محکمۂ انکم ٹیکس نے آنکھیں بند رکھیں، وہ طاقتور طبقوں کو چیلنج کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ پلاٹوں کی خرید و فروخت کا منافع کیپیٹل گین شمار ہوا۔ کسی وفاقی محکمہ کو غیرمنقولہ جائیدادوں کے کیپیٹل گین پر ٹیکس عاید کرنے کا آئینی اختیار حاصل نہیں۔ صوبوں نے کیپیٹل گین ٹیکس کا قانون بنا رکھا تھا۔ 1988ء میں سب صوبوں نے اس قانون کو منسوخ کر دیا۔ صنعتی اعتبار سے ترقی کرنے والے ممالک (مثلاً انڈونیشیا اور ملائشیا) پراپرٹی کی خرید پر ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ اس طرح پراپرٹی میں سٹے بازی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

7۔ محکمۂ انکم ٹیکس کے پاس چھپی دولت پر ٹیکس عائد کرنے کا قانونی اختیار ہے۔ اگر کسی پراپرٹی یا شے کے بارے میں شک ہو کہ اس کی خرید مارکیٹ ریٹ سے کم ہے تو وہ رعایتی رقم کا تخمینہ لگا کر وسائل کی وضاحت طلب کر سکتا ہے۔ اگر وضاحت ناقابلِ تسلیم ہو تو اتنی رقم جس کے بارے میں وضاحت غیر تسلی بخش ہو، ٹیکس عاید ہوگا۔ پراپرٹی کے مسئلہ پر محکمۂ انکم ٹیکس اور ٹیکس گزاروں کے درمیان جھگڑا رہتا تھا۔ حکومت نے اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے ایک قاعدہ وضع کیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو اختیار دے دیا کہ وہ رہائشی سکیموں کے پلاٹوں کے مارکیٹ ریٹ کا تعین کر کے رجسٹریشن اتھارٹی کو پابند کر دے کہ اس دستاویز کو رجسٹر نہ کرے جس میں قیمت مقررہ ریٹ سے کم درج ہو۔ ڈپٹی کمشنر کا ریٹ شیڈول انکم ٹیکس کے لیے قابلِ قبول بن گیا۔ بظاہر یہ سکیم اچھی تھی۔ مگر اچھے کام کو بُرے عملدرآمد سے بے اثر بنایا جا سکتا ہے۔ یہی انجام اس سکیم کا ہوا۔ ڈپٹی کمشنر کا ریٹ شیڈول بدلتے تقاضوں کے مطابق ترمیم نہ ہوا۔ اس معاملہ کو ہم مثال سے بیان کریں گے۔ جو پراپرٹی 5 لاکھ کی تھی، چند سال بعد بیس پچیس لاکھ کی ہوگئی۔ خریدار نے پراپرٹی 25 لاکھ کی خریدی مگر اس کی قیمت ڈپٹی کمشنر کے مقرر کردہ ریٹ 5 لاکھ کے مطابق دکھائی۔ یہ قیمت رجسٹریشن اتھارٹی اور محکمۂ انکم ٹیکس کے لیے قابلِ قبول تھی۔ یوں اس پراپرٹی میں کالے دھن کے 20 لاکھ روپے کھپ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ پراپرٹی کی قیمتوں میں یکا یک اُبھار (بوم) آیا اور پراپرٹی کی قیمت مزید بڑھ گئی۔ 25 لاکھ کی خرید شدہ پراپرٹی 60 لاکھ کی بک گئی۔ کالے دھن میں 35 لاکھ کا

مزید اضافہ ہو گیا۔ اب ایک بھلے سرکاری افسر کا معاملہ دیکھئے۔ سرکار نے اسے ایک پلاٹ دو لاکھ میں الاٹ کیا۔ اس نے چند سال بعد 60 لاکھ میں بیچ دیا۔ دستاویز پانچ لاکھ کی لکھی۔ اگر کالا دھن نہ ہوتا تو وہ پچپن لاکھ کے کالے دھن کا مالک نہ بنتا۔ ایسی صورت میں حکمران طبقات کو کالا دھن ختم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ جنرل مشرف نے 2004ء میں ٹیکس چھپانے والوں پر کمال مہربانی کی۔ اُنہوں نے انکم ٹیکس آرڈیننس کی متعلقہ مد (سیکشن 111) میں ترمیم کر دی کہ ایسی چھپی دولت کے بارے میں کوئی پوچھ نہ ہوگی جو محکمہ کی نظر سے پانچ سال تک اوجھل رہے۔ اس ترمیم کی وجہ سے ٹیکس چھپانے والے کے ساتھ خائن اور رشوت خور کو بھی انکم ٹیکس کا تحفظ مل گیا جس نے جرم کی دولت کو پانچ سال پوشیدہ رکھا۔

کرپشن کی دولت کے مالک کی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنی نسل کے لیے دولت کے ڈھیر لگائے۔ اپنے لیے عالی شان محل بنائے۔ بچوں کو غیرملکوں میں مہنگی اور اعلیٰ تعلیم دلوائے۔ اگر ہفتے میں نہیں تو مہینے میں ایک بار کسی مہنگے ہوٹل میں ڈنر کرے۔ اس کے بچے مہنگے سے مہنگے برانڈ کے لباس پہنیں۔ غیرملکوں کی سیر کریں۔ اور اگر ہو سکے تو بحیرۂ روم کے ساحل پر وِلا (Villa) خریدے۔ فرانس میں مکان بنائے۔ اس کے بچے امریکا میں آباد ہوں۔ کینیڈا میں دولت منتقل کر کے اس ملک کی شہریت حاصل کرے۔ یوں بالادست طبقے کا ایک رسمی سا تعلق غربت کے اس خطے سے رہ جاتا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ اس تعلق کا اظہار وہ ایئرکنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں سیاسی بحث و مباحثہ سے کرتا ہے۔

8۔ آسان دولت کے اس انبار نے مہنگی اشیاء کی الگ مارکیٹ اور الگ رہائشی سکیم قائم کر دی۔ بہت سے مالدار لوگ ایسے ہیں جنہیں گلبرگ اور ڈیفنس کی کالونیاں بھی پسند نہیں اور اُنھوں نے بڑے بڑے فارم ہاؤسز بنا کر دُنیاوی جنت قائم کر لی ہے۔ یہ سارا کچھ اس لیے ہے کہ ٹیکس کے قانون میں جھول ہے۔ بالادست طبقات جو سیاسی اور سماجی طاقت کے مالک ہیں، ایسے ٹیکس کا قانون نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں جس سے ان کی معاشی طاقت اور نمائشی زندگی کو آنچ آئے۔ غریب عوام کو رام کرنے کے لیے وہ کچھ خیرات کر دیتے ہیں، کہیں چندہ بھی دے دیتے ہیں۔ تاکہ اُن کی مدح ہو اور انہیں دُعائیں دینے والے موجود رہیں۔

9۔ دولت کمانے کے کئی ذریعے ایسے ہیں جن پر انکم ٹیکس عاید نہیں، مثلاً پراپرٹی اور شیئرز کا کیپیٹل گین۔ زرعی آمدن پر صوبائی انکم ٹیکس عاید تو ہے مگر برائے نام۔ دولت مند افراد کے کئی ذرائع آمدن مثلاً کرایہ اور ڈیوڈنڈ پر رعایتی (Presumptive) ٹیکس ہے۔ ان معاملات کا ذکر الگ ہوگا۔ سیاسی اور بڑے عہدہ پر فائز افراد عملاً محکمہ ٹیکس کی رسائی سے بلند ہوتے ہیں۔ ٹیکس کہیں بھی کوئی خوشی سے نہیں دیا کرتا۔ تاہم کئی ممالک میں ریاست ٹیکس وصول کرنے میں سنجیدہ ہوتی ہے اور وصول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں ایسا نہیں۔ ہمارے یہاں ٹیکس کا قانون بنانے کی سیاسی طاقت کا حامل طبقہ یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔

10۔ ہمارے ملک کے قانون میں کالے دھن کو دھونے کا سامان موجود ہے۔

اگر کالے دھن کے مالک کو کوئی ایسا اثاثہ بنانے کی ضرورت ہو جسے چھپانا ممکن نہ ہو تو وہ غیر ملک سے اپنے نام پر زرِ مبادلہ کی ترسیل کا انتظام کر لیتا ہے۔ ملک میں زرِ مبادلہ کے ایجنٹ موجود ہیں جو معمولی معاوضہ کے عوض ترسیل کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ جب یہ ترسیل شیڈولڈ بنک کے ذریعے ہو تو محکمۂ انکم ٹیکس اس پر ٹیکس عاید نہیں کرتا۔ یہ قانون بھارت میں بھی موجود ہے، مگر وہاں ٹیکس کا شکنجہ نسبتاً مضبوط ہے۔ وہاں متوسط درجے کے تاجروں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے حسابات کا آڈیٹ کروائیں۔ ہمارے یہاں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ تاہم بھارت کی مثال سے یہ تاثر نہیں قائم ہونا چاہیے کہ وہاں کوئی عیب نہیں۔ یقیناً وہاں غلطیاں اور خرابیاں ہیں اور بھارت مجموعی طور پر ہمارے لیے قابلِ تقلید مثال نہیں۔

11۔ ہمارے ملک میں ٹیکس کلچر کا فروغ ممکن نہ تھا۔ ٹیکس کلچر کے لیے صنعتی تہذیب درکار ہوتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت معاشرے کی مجموعی ساخت زرعی، قبائلی یا نیم قبائلی تھی۔ قومی پیداوار میں زراعت کا حصہ 60 فیصد تھا۔ معاشی طاقت بڑے زمینداروں کو حاصل تھی۔ 0.1 فیصد بڑے زمینداروں کا نجی زرعی اراضی میں حصہ 15.4 فیصد تھا۔ (حوالہ ڈاکٹر محمود حسن خان، Underdevelopment and Agrarian Structure in Pakistan, 1981, p.68.) ملک کی طاقتور سیاسی جماعت مسلم لیگ پر بڑے زمینداروں کا اثر ونفوذ تھا۔ بڑے شہروں میں نفاذِ اسلام کی حامی تنظیمیں بھی اثر رکھتی تھیں۔ مسلم لیگ اور علما کرام کے مابین نجی معیشت پر استوار جمہوری اسلامی فلاحی ریاست کے نظریے پر اتفاق ہو گیا۔ بات

دعویٰ تک رہی۔ ملک جمہوری بنا نہ فلاحی۔ عملاً ایک منافق معاشرہ سامنے آیا۔ فرقہ پرستی اور انتہاپسندی پھلی پھولی۔ یہ ماحول ٹیکس کلچر کا گلا گھونٹنے والا تھا۔

12۔ اکثر مسلمان دولت کو سماجی عمل کا نتیجہ قرار نہیں دیتے، وہ آمدن یا دولت کے سلسلے میں معاشرے کا کردار تسلیم نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ٹیکس کی جدید تھیوری اور نظام نہیں بھاتا۔ روایت پرست لوگ سماجی انصاف کا جدید تصور اور تنظیمی سٹرکچر تسلیم نہیں کرتے۔ ٹیکسوں سے نفرت کی دوسری قابلِ ذکر وجہ یہ ہے کہ حکومت کی مخاصمت کا رویہ ہمیں ورثہ میں ملا۔ ہم برٹش حکومت کو غیر سمجھتے تھے۔ وہ تھے بھی غیر۔ مگر ان کی کرسی پر متمکن مقامی بھی اپنے نہ بنے اور پھر نئی ریاست نے برطانیہ کا چھوڑا ہوا غیر منصفانہ نوآبادیاتی انتظامی ڈھانچا قائم رکھا۔ ہم حکومت سے ناخوش رہے۔ اس رویہ کی بنا پر ٹیکس گریزی کا رجحان قائم رہا۔ فکری رویوں میں تبدیلی اس صورت میں واقع ہو سکتی تھی اگر سماجی سٹرکچر میں ایک جھٹکے سے بڑی تبدیلی واقع ہوتی۔ مثلاً اگر بنیادی نوعیت کی زرعی اصلاحات ہو جاتیں۔ جاپان اور کوریا نے زرعی اصلاحات کیں۔ اس طرح وہاں فکری رویوں میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ ایک وجہ تھی کہ وہاں معاشرتی اور معاشی ترقی آسان ہوگئی۔

13۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ناجائز دولت سماجی ناہمواری کا ایک بڑا سبب ہے۔ یہ دولت معاشرے کے اُن طبقوں کے پاس ہوتی ہے جو سماجی اور سیاسی طور پر طاقتور ہوں، ریاستی اختیارات کے مالک ہوں یا پہلے سے دولت مند ہوں۔ ہمارے یہاں کالے دھن نے سماجی ناانصافی بڑھائی ہے۔ معاشرے میں نمود

ونمائش کے اخراجات، بڑے بڑے رہائشی گھر اور نمائشی اثاثوں کو فروغ دیا ہے۔ کالا دھن زیادہ تر معیشت کے ان شعبوں کی جانب راغب ہوا جو براہِ راست پیداواری نہیں یا کم پیداواری ہیں۔ دوسری جانب غریب طبقات کو صحت بخش خوراک اور پینے کا پانی میسر نہیں۔ بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں آدمی اُسی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں جن سے اونٹ، گائے، بھینسیں، درندے اور کتے پیتے اور نہاتے ہیں۔ ہمارے یہاں آبادی کی بھاری اکثریت کو تعلیم اور علاج کی سہولیات اور رہائشی مکانات میسر نہیں، انہیں بیروزگاری کا سامنا ہے۔ معاشرے کے یہ متضاد رُخ ظالمانہ رویوں کو اُبھار چکے ہیں۔ یہ ایک وجہ ہے کہ مذہبی افکار اور رویہ میں تشدد ابھرا۔

14۔ سرمایہ سماجی اور سیاسی طاقت رکھتا ہے، اس کے ذریعے سیاست کو کنٹرول کرنا آسان ہوتا ہے۔ جب دھن کالا ہو تو وہ سیاست کا رنگ بھی کالا کر دیتا ہے۔ کالے دھن کے مالک سیاستدان عوام کی سوچ کو اپنے ڈھب پر ڈالنے کے لیے پراپیگنڈا کا سامان کرتے ہیں۔ گویا ٹیکس کا ناقص نظام معاشرے کی تہذیب اور جمہوری نظام پر بُرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس لیے ٹیکس کا معاملہ محض فنی اور انتظامی نہیں ہوتا۔ ٹیکس کا نظام معاشرتی اور سیاسی معاملہ ہے۔ صحت مند فکر اور نئی سماجی طاقت اُجاگر کرنے کے لیے اس نظام کی اصلاح درکار ہے۔

15۔ کالے دھن کی معیشت جتنی بڑی ہوگی، وہ دستاویزات کے مطابق چلنے والی معیشت کے لیے اتنی مشکلات پیدا کرے گی۔ ظاہر ہے کہ چھپا ہوا کاروبار ٹیکس ادا نہیں کرتا، ٹیکس آمدن کی کمی کو پورا کرنے کے لیے حکومت ان اداروں پر زیادہ

بوجھ لاد دیتی ہے جو ٹیکس ریکارڈ پر پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ یہ ادارے مسابقت میں پٹ جاتے ہیں اور حالات کے جبر کے تحت ٹیکس چھپانے لگتے ہیں۔

16۔ کالے دھن کی معیشت پر حکومت کا کنٹرول نہیں ہوتا یا کنٹرول ناقص ہوتا ہے۔ معاشی عمل ریگولیٹ کرنے کے لیے حکومت جو معاشی حکمتِ عملی اختیار کرتی ہے، اس کا اطلاق اس معیشت پر نہیں ہوتا جو زیرِ زمین ہوتی ہے۔ کالی معیشت کے باعث حکومت کے تیار کردہ اعداد و شمار صحیح اور قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے معیشت کے نظم و نسق کو تسلی بخش بنانا مشکل ہوتا ہے۔

17۔ معاشی تھیوری کا مطالبہ ہے کہ کالے دھن کی معیشت کو قابو کیا جائے۔ حکومت نے ٹیکس کی معافی (Tax Amnesty) کی سکیمیں بار بار جاری کیں تاکہ چھپے ہوئے اثاثے دستاویزات میں ظاہر (ڈاکومنٹ) ہو جائیں۔ مگر تاجروں اور کارخانہ داروں کی اکثریت نے عدم تعاون سے سکیمیں ناکام بنا دیں۔ اُنہوں نے سیاست دانوں اور بیوروکریسی پر الزام لگایا کہ یہ طبقات خود صحیح ٹیکس ادا نہیں کرتے انہیں کیا حق ہے کہ ان سے پورا ٹیکس وصول کرنے کا اقدام کریں۔

18۔ جنرل ضیاء الحق نے 1985ء میں کالے دھن کو دھونے کے لیے ایک خصوصی سکیم جاری کی، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ کالے دھن کے مالکوں پر کوئی ٹیکس عاید نہ تھا۔ سکیم میں صرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ کالے دھن کے برابر سپیشل نیشنل فنڈ بانڈ خرید لیں (یعنی حکومت کو قرضہ دے دیں) جس پر انہیں منافع (سود) دیا جائے گا۔ اس طرح بانڈ کی مالیت کے برابر کالا دھن دھل جاتا۔ جنرل صاحب کو بھروسا تھا

کہ تاجر ان کے حامی ہیں، وہ ایمنسٹی سکیم کا مثبت جواب دیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ حکومت نے خفت دُور کرنے کے لیے مزید رعایت دی کہ وہ بنکوں سے رقم اُدھار لے کر مذکورہ بانڈ خرید لیں، بنک سود کی شرح بھی اس شرح سے کم رکھی جو حکومت بانڈوں پر ادا کرنے کا اعلان کر چکی تھی۔ حکومت کے ایما پر بنک حکام تاجروں کی منت سماجت کرتے رہے کہ سپیشل بانڈ خرید لیں۔ ٹیکس گزاروں کو معلوم تھا کہ اگر چھپی ہوئی دولت ڈاکومنٹ ہوگئی تو مستقبل کے ٹیکس میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے لیے وہ راضی نہ تھے۔ چنانچہ کالا دھن بلیک اکانومی کے فروغ کا ذریعہ بنا رہا۔ یہ دھن بنک ڈپازٹ، سٹاک ایکسچینج اور غیرمنقولہ جائیدادوں کی طرف مڑ گیا۔ کچھ سونے، ڈالروں اور ذخیرہ اندوزی کی شکل میں زیرِ زمین چلا گیا۔ اکثر تاجروں اور صنعت کاروں نے موجود سامان (سٹاک) کی مالیت کم دکھا کر کالا دھن چھپایا ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے دور میں حکومت نے کالے دھن پر ترقیاتی عمل کی بنیاد رکھ دی۔ 1990ء میں یہ خصوصی رعایت دی گئی کہ جو سرمایہ صنعتی کمپنیوں کو قائم کرنے میں لگایا جائے گا، اس کی باز پرس نہ ہوگی۔ نئی صنعتی کمپنیوں کو ٹیکس ہالیڈے بھی دی گئی۔ علاوہ ازیں زرِمبادلہ کی ترسیلات اور فارن کرنسی اکاؤنٹ کو پوچھ گچھ سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ بعد ازاں جب حکومت نے سرکاری صنعتی اداروں کی نج کاری کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے کالے دھن پر ایک بار پھر بھروسا کیا۔ حکومت کی طرف سے یہ خصوصی رعایت دی گئی کہ جو سرمایہ سرکاری ادارے خریدنے کے لیے صرف ہوگا، اس کے بارے میں کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی۔ یہ اقدامات کالی معیشت کو ختم نہ کر سکے۔ ظاہر ہے

کہ عام حالت میں دولت پیدا کرنے کا عمل ہر ساعت جاری رہتا ہے، کالا دھن اِس عمل میں بھرپور شریک ہے مگر کالے دھن کی پیدا کردہ دولت کا رنگ کالا ہی ہوتا ہے، یعنی اس پر ٹیکس ادا نہیں ہوتا۔

19۔ ہم نے دیکھا کہ ٹیکس ایمنسٹی کی سکیمیں کالے دھن کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہوئیں۔ جنرل پرویز مشرف نے ایک بار فوجی افسروں کی نگرانی میں بزنس سروے کروایا تاکہ معیشت کی ڈاکومنٹیشن کی جا سکے۔ یہ سروے بھی کامیاب نہ ہوا۔ حکومت نے قوانین بنا رکھے ہیں کہ تاجر اشیا فروخت کرتے وقت کیش میمو یا بل جاری کریں۔ کم لوگ ہی اس کا احترام کرتے ہیں۔ حساب کتاب ریگولیٹ کرنے کے لیے بہت سے اچھے قوانین موجود ہیں، ان پر عملدرآمد نہیں ہوتا اور نہ حکومت کے پاس سیاسی ارادہ ہے کہ ان پر عملدرآمد کرائے۔ البتہ آئی ایم ایف نے ایسی قانونی اصلاحات جاری کروا دی ہیں جن پر عملدرآمد ٹیکس گزاروں کے تعاون کا محتاج نہ تھا۔ مثلاً ٹیکس ہالیڈے کی رعایت آئی ایم ایف کے تقاضے پر ختم کی گئی۔ فارن ایکسچینج حاصل کرنے کے لیے ڈالر سرٹیفکیٹ اور فارن کرنسی اکاؤنٹس کی سکیمیں بھی آئی ایم ایف کے دباؤ کے تحت ختم ہوئیں۔ مگر ایک سکیم جاری رہی۔ جاری سکیم کے تحت بنکوں کے ذریعہ غیرملکی کرنسی کی ترسیلات پر محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے کسی پوچھ گچھ کی اجازت نہیں۔ ہمارے حالات میں ایسی رعایت کی موجودگی میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ٹیکس کی ادائیگی میں بہتری ہوگی۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ناجائز دولت کے مالکان نے اپنے یا اپنے عزیز و اقارب کے نام پر غیرمنقولہ جائیدادیں اور دوسرے

اثاثے خریدے۔ انہیں کسی محاسبہ کا خطرہ نہیں۔ یہ اثاثے غیرملکی کرنسی کی ترسیلات کے ذریعے محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ گویا یہ ترسیلات قومی جرم کی پردہ پوشی کر رہی ہیں۔ یہاں ایک مشکل ہے۔ یہ کہ قومی خزانہ کو زرِ مبادلہ کی کمی کا سامنا ہے، اگر زرِ مبادلہ کی ترسیل نہ ہو تو زرِ مبادلہ کا بحران پیش آئے گا۔ ایسے کئی تضادات ہمیں درپیش ہیں۔ کسی نظام کو کمزوریوں اور تضادات سے مکمل طور پر پاک کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ انہیں کنٹرول میں رکھنے کا مسلمہ طریقہ یہ ہے کہ معیشت ڈاکومنٹ ہو، انتظامیہ شفاف ہو، ملک میں قانون کی عملداری ہو، امن ہو، سیاسی تبدیلی کے آئینی طریقہ پر عمل ہو، معاشرے میں رواداری ہو۔ اور ایسا معیشرتی (معاشی اور معاشرتی) نظام پروان چڑھے جس میں عوام کے مسائل حل ہونے شروع ہوں۔ ان سب باتوں کو ایک فقرے میں سمویا جا سکتا ہے کہ معاشرے کی تہذیب و تمدن کی سطح بلند ہونی چاہیے۔ جوں جوں ہم تہذیبی اعتبار سے آگے بڑھیں گے ٹیکس گریزی کا رجحان پیچھے ہٹے گا۔

ٹیکس نظام کے

مراعات یافتہ طبقات

پاکستان کے مراعات یافتہ طبقات تین بڑی اقسام کے ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جس کے ہاتھ میں ریاست کی طاقت رہی ہے۔ میرا اشارہ اُن فوجی حکام اور اُن کے آلۂ کاروں، مقبول رہنماؤں اور ان کے خوشہ چینوں کی طرف ہے جنہوں نے اپنے اپنے اقتدار کے دور میں ریاستی طاقت کی بنیاد پر مراعات حاصل کیں۔ دوسری قسم میں وہ طبقہ آتا ہے جو سماجی اور معاشی طاقت کا حامل ہے اور اس طاقت کے ذریعہ حکومتی پالیسی پر اثرانداز ہوتا ہے۔ میرا اشارہ بڑے زمینداروں، قبائلی لیڈروں اور بڑے صنعتکار خاندانوں کی جانب ہے جنہوں نے اپنے اپنے طبقات کے لیے مراعات حاصل کیں۔ اور تیسری قسم وہ ہے جو کالا دھندا کرتے ہیں مثلاً سمگلر، لینڈ مافیا، سٹے باز وغیرہ جو مروجہ نظام کا طاقتور حصہ بن چکے ہیں۔

2۔ 2008ء میں درپیش مالی بحران پر قابو پانے کے لیے زرعی آمدن پر ٹیکس کی بات سامنے آئی۔ قومی اسمبلی اور پنجاب اسمبلی کے کئی ارکان نے حسبِ سابق مخالفت کی۔ اس بارے میں دلیل دی گئی کہ کاشتکار زرعی انکم ٹیکس کا بوجھ برداشت

کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اِس دعوے کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔ زرعی ماہرین کے مطابق نہری خودکاشت اراضی سے فی ایکڑ آمدن 20 ہزار روپے سے زائد ہے۔ ایسی اراضی اگر پٹے پر ہی دی جائے تو 20 ہزار روپے فی ایکٹر مل جاتے ہیں۔ سائنٹفک فارمنگ کرنے والے کاشتکار کہیں زیادہ کما رہے ہیں۔ سائنٹفک کاشتکار جو سرمایہ انویسٹ کرتے ہیں ایک ایکڑ سے لاکھ روپے آمدن حاصل کرتے ہیں۔ 2000ء میں 25 ایکڑ یا زیادہ رقبے کے مالکان کی تعداد 2,74,921 تھی۔ 25 ایکڑ اراضی کا مالک عام کاشتکار سالانہ 5 لاکھ روپے سے زائد آمدن کما لیتا ہے۔ پھل کے باغ سے آمدن زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ 25 ایکڑ اور زیادہ رقبہ کے مالکانِ اراضی پر اس شرح سے انکم ٹیکس عائد نہ ہو جو تاجر اور دکاندار کے لیے مقرر ہے۔ ابتداً اگر 25 ایکڑ اور زائد اراضی کے مالک پر زرعی انکم ٹیکس عاید ہو تو زیرِ کاشت اراضی کا 39 فیصد حصہ ٹیکس کے احاطہ میں شامل ہو گا اور صرف 6 فیصد مالکان ٹیکس کی زد میں آئیں گے۔ یہ اچھی شروعات ہوگی۔ (زرعی اراضی اور اس کی ملکیت کے بارے میں اعداد و شمار زرعی شماریات 2000ء کے صفحہ 12 سے اخذ کیے گئے۔) شاید زرعی انکم ٹیکس کا نفاذ کئی غیرحاضر زمینداروں .اور ایسے کاشتکاروں کے لیے بوجھ بن جائے جو سائنٹفک کاشتکاری نہیں کرتے۔ ان پر انکم ٹیکس کے نفاذ کی وجہ دوسری ہے۔ اگر افراد پر انکم ٹیکس کی حد 25 یا 30 فیصد سے بلند نہ ہو تو ٹیکس کا نفاذ جو ٹیکس گزار کو نفسیاتی طور پر آمادہ کرتا ہے کہ ٹیکس ادائیگی سے مالی نقصان کو پورا کرنے کے لیے آمدن بڑھانے کی منصوبہ بندی کرے۔ شروع میں

حکومت کو چاہیے کہ جو زرعی ٹیکس گزار ڈویلپمنٹ کے لیے سرمایہ کاری کرے، اسے ٹیکس کی رعایت دی جائے۔ ٹیکس کے حربہ کا صحیح استعمال عام طور پر ترقیاتی عمل کو تیز کرتا ہے۔

3۔ بڑے زمینداروں پر ہمارا ٹیکس کا قانون مہربان رہا ہے۔ کیوں نہ ہوتا، قانون بنانے والے بڑے زمیندار تھے یا ان کے حکمران ساتھی یا پھر آلۂ کار۔ حکمران گروہ قانون بناتے وقت اپنے اور اپنے ساتھیوں کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ جب تک اسٹیٹ ڈیوٹی کا قانون رائج تھا، زرعی املاک پر اس کا نفاذ نہ ہونے کے برابر رہا، یہی صورت ویلتھ ٹیکس کی تھی۔ آئین کی رو سے زرعی آمدن پر وفاقی انکم ٹیکس عائد نہیں ہوتا۔ صوبائی حکومتیں جنہیں قانون بنانے کا اختیار ہے، انہوں نے زرعی انکم ٹیکس کا برائے نام قانون جاری کر رکھا ہے۔ اس قانون کے تحت 2007-08ء کے دوران چاروں صوبوں کو مجموعی تقریباً 1 ارب 14 کروڑ روپے وصول ہوئے جس کی قومی پیداوار سے نسبت 0.01 فیصد ہے جب کہ قومی پیداوار میں زراعت کا حصہ 21 فیصد ہے۔

4۔ زرعی آمدن پر ٹیکس کی تاریخ کا مختصر ذکر ہو جائے۔ زرعی ٹیکس کے بارے میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسی بدلتی رہی۔ بھٹو صاحب کے پیش رو جنرل یحیٰی نے جب زرعی ٹیکس کے نفاذ کی تجویز پر غور کیا تو اُنہوں نے یحیٰی کو ایک مفصل تار بھیج کر مخالفت کی۔ یہ بات 1970ء کی ہے۔ 1977ء کے الیکشن کے قریب پیپلز پارٹی کی حکومت نے زرعی آمدن پر ہلکا پھلکا وفاقی ٹیکس عائد کیا۔ زرعی آمدن کا تعین

پیداواری یونٹ کی بنیاد پر تھا جس کی رُو سے ایک سو ایکڑ زرعی اراضی کے مالک سے زرعی آمدن پر زیادہ سے زیادہ 1100 روپیہ ٹیکس وصول ہوتا۔ (زرعی اصلاحات کے مطابق زرعی اراضی کی قانونی ملکیت ایک سو ایکڑ اراضی تھی۔) پی این اے کی تحریک کے بعد 2 جولائی 1977ء کو وفاقی انکم ٹیکس ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور زرعی آمدن کو انکم ٹیکس کے تحت تشخیص کردہ آمدن میں شامل کر لیا گیا۔ البتہ زرعی آمدن پر عاید ٹیکس کی رقم صوبوں میں تقسیم کرنے کی پابندی تھی۔ نئے قانون کے مطابق زرعی آمدن کا تعین پیداواری یونٹ کے مطابق تھا، جس سے زرعی مشینری کی خرید اور زرعی زمین کی ڈیولپمنٹ کی لاگت منہا کی جاتی تھی۔ اس طریقہ سے حکومت کو شاید ہی کوئی ٹیکس وصول ہوتا البتہ زراعت کی جدیدیت کا عمل جاری ہو جاتا۔ مگر ٹیکس کے قانون کا وجود ہی بڑے زمینداروں کے لیے ناگوار تھا۔ جب جنرل ضیاء الحق نے حکومت پر قبضہ کیا، تو بڑے زمینداروں کے مطالبہ پر اُنہوں نے پیپلز پارٹی کے بنائے ہوئے قانون کو منسوخ کر دیا۔ منسوخی کے مطالبہ میں دین کے نام پر سیاست کرنے والے بعض لیڈر زمینداروں کے ہمنوا تھے۔

5۔ 1988ء میں وفاقی حکومت نے زرعی آمدن پر بالواسطہ طور پر ٹیکس نافذ کرنے کا ایک طریقِ کار نکالا۔ وفاقی انکم ٹیکس ایکٹ میں ترمیم کے ذریعہ کاروباری آمدن میں زرعی آمدن شامل کر لی گئی اور ٹیکس مجموعی آمدن پر نافذ ہوا۔ اس طرح ٹیکس کی شرح بڑھ جاتی جو عاید صرف تجارتی آمدن پر ہوتی۔ زرعی آمدن مستثنیٰ رہتی۔ وہ افراد جن کی آمدن کا ذریعہ ملازمت تھا، اس پر اس قانون کا نفاذ نہ کیا گیا۔ گویا

ٹیکس کا نفاذ ان زمینداروں پر نہ ہوا جو تجارت نہیں کرتے تھے۔ ان زمینداروں پر بھی نہ ہوا جو ملازمت پیشہ تھے۔ تجارت کرنے والے زمینداروں کی زرعی آمدن پر بالواسطہ ٹیکس عاید کرنے کا یہ طریقِ کار بھی 2002ء میں ختم ہو گیا جب انکم ٹیکس کے نئے قانون میں اس مد کو شامل نہ کیا گیا۔

6۔ اب زرعی آمدن پر صوبائی انکم ٹیکس عاید ہوتا ہے جس کی شرح معمولی ہے۔ اس کی شرح بڑھانے میں اب کوئی معاشی دلیل حائل نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے زرعی اجناس کی قیمتوں کو دانستہ کم رکھا جاتا تھا تاکہ عام صارفین کو سستی خوراک اور صنعتوں کو سستا خام مال مہیا کیا جائے۔ یہ طریقہ کار ختم ہو چکا۔ اب زرعی اجناس کی قیمتوں کی سطح بہت بلند ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ زرعی آمدن پر اونچی شرح سے ٹیکس عاید نہ ہو۔ یہ بات صحیح ہے کہ زرعی شعبہ اشیا پر وفاقی ٹیکس ادا کرتا ہے۔ مثلاً کھاد، زرعی ادویات اور مشینری پر Indirect Tax (بالخصوص سیلز ٹیکس) نافذ ہے۔ ان کی مجموعی وصولیوں سے نسبت 1.2 فیصد ہے۔ اس کے مقابلہ میں مینوفیکچرنگ سیکٹر فیڈرل بورڈ آف ریونیو کو ٹیکسوں کی جو رقوم ادا کرتا ہے، اس کی کل قومی ٹیکسوں سے نسبت 62 فیصد ہے۔ مینوفیکچرنگ سیکٹر کا قومی پیداوار میں حصہ 18 تا 20 فیصد ہے۔ (حوالہ اکنامک سروے، 2005-06، صفحہ 66) چنانچہ زرعی مداخلات پر وفاقی ٹیکس جواز فراہم نہیں کرتا کہ صوبائی حکومت زرعی آمدن پر اونچی شرح سے ٹیکس عاید نہ کرے۔

7۔ یہ بات باعثِ تشویش ہے کہ سیاسی اور سماجی طاقت کا حامل زمیندار طبقہ

یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ موثر زرعی انکم ٹیکس عاید نہ ہونے دے گا۔ ہمارے ملک میں 150 ایکڑ سے زائد زرعی اراضی کے مالکان کی تعداد 11,597 ہے اور اُن کے پاس 34,15,261 ایکڑ اراضی ہے۔ یعنی زرعی اراضی کے 0.23 فیصد مالکان کے پاس کل زرعی اراضی کا 9.24 فیصد حصہ ہے۔ اسی طبقہ کے افراد ملک کی سیاست پر حاوی ہیں اور قانون ساز اسمبلیوں پر موثر کنٹرول رکھتے ہیں۔ اگر یہی طبقہ ٹیکس ادا کرنے کا معاشرتی فرض ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تو اسے یہ حق کیسے پہنچتا ہے کہ وہ عوام کی نمائندگی اور حکمرانی کا اختیار حاصل کرے۔

8۔ قانونی ساز اسمبلیوں کو زرعی اجناس کی فروخت پر ہی ٹیکس عاید کر دینا چاہیے۔ یہ ٹیکس ایسی زرعی اجناس پر عائد کیا جا سکتا ہے جو خام مال کے طور پر استعمال ہوتی ہیں مثلاً تمباکو، گنا، کپاس، مکئی، بنولہ اور خوردنی تیل کے بیج وغیرہ۔ ایسے ٹیکس کی وصولی کی ذمہ داری ان صنعتی اداروں پر عاید کر دی جائے جو یہ اجناس خریدتی ہیں۔ یہ ادارے اجناس کی قیمت ادا کرتے وقت ٹیکس کی رقم کاٹ کر خزانہ میں جمع کرا دیں۔ اس مقصد کے لیے بڑی ٹیکس مشینری کی ضرورت نہ ہوگی۔ نہ زمینداروں کو حساب کتاب رکھنے کی زحمت اُٹھانی پڑے گی۔

II

9۔ بغیر محنت کے اچھل دولت کا بڑا ذریعہ غیرمنقولہ جائیدادوں کی خرید و فروخت سے حاصل ہونے والا منافع ہے۔ ہر فرد آگاہ ہے کہ پراپرٹی کی خرید و

فروخت کے ذریعے مالدار اور بڑے لوگوں نے کروڑوں اور اربوں روپے کمائے ہیں۔ 1986ء تک صوبائی حکومتیں غیرمنقولہ جائیدادوں کی فروخت سے حاصل شدہ منافع پر کیپیٹل گین ٹیکس وصول کیا کرتی تھیں۔ یہ قانون 1986ء میں منسوخ کر دیا گیا۔ انہی ایام میں چند دولت مند افراد نے بڑے بڑے شہروں کے قریب واقع بڑے قطعاتِ زمین خرید کر چھوٹے چھوٹے پلاٹوں میں تقسیم کر کے بیچنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ بڑی بڑی رہائشی سکیمیں قائم ہو رہی تھیں۔ ٹیکس سے چھپی دولت کا رُخ اس جانب مڑ گیا۔ رہائشی پلاٹوں کی طلب اور قیمت میں اضافہ ہو گیا۔ صنعتی سرمایہ کاری میں دلچسپی نہ پائی جاتی تھی۔ حکمرانوں نے غیرمنقولہ جائیداد کی فروخت کے سلسلے میں انکم ٹیکس حکام سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی پیشگی شرط ختم کر دی۔ اس طرح سٹے بازی کے کاروبار کو آسانی مل گئی۔ کیپیٹل گین ٹیکس کی منسوخی سے صوبائی حکومت کو جو نقصان ہوا اس نے سٹیمپ ڈیوٹی کی شرح بڑھا کر پورا کر لیا۔ نتیجتاً قطعۂ اراضی خریدنے والوں پر سٹیمپ ڈیوٹی کا بوجھ بڑھ گیا۔ اس طرح رہائشی مکانوں کی لاگت میں اضافہ ہو گیا۔

10۔ جب دولت مند افراد نے پراپرٹی کے کاروبار کے ذریعے کروڑوں اور اربوں روپے کما لیے تو وفاقی حکومت نے کیپیٹل ویلیو ٹیکس عاید کیا تاکہ آئندہ سٹے بازی کی روک تھام ہو سکے۔ اس کا نفاذ عمارتوں، فلیٹوں اور رہائشی و کمرشل پلاٹوں کے خریداروں پر ہوتا ہے۔ جو قیمتِ خرید پر 2 فیصد کے حساب سے ادا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں خریدار 2 فیصد کے حساب سے سٹیمپ ڈیوٹی ادا کرتا ہے جو صوبائی

حکومت کو جاتی ہے۔ لوکل گورنمنٹ بھی خریدار سے ایک فیصد کے حساب سے ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس طرح خریدار مجموعی طور پر پانچ فیصد کے حساب سے تین حکومتوں کو ٹیکس ادا کرتا ہے۔ فروخت کرنے والا کسی قسم کا ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ مناسب ہوگا کہ وفاقی حکومت فروخت کنندہ سے بھی 5 فیصد کے حساب سے کیپیٹل ویلیو ٹیکس وصول کرے اور اس کی رقم صوبائی حکومتوں کو منتقل کر دے۔

11۔ زیادہ مناسب ہے کہ صوبائی حکومتوں میں ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کا رویہ پیدا ہو۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو بجائے اس کے کہ وفاقی حکومت فروخت کنندہ سے کیپیٹل ویلیو ٹیکس وصول کرے، صوبائی حکومت کیپیٹل گین ٹیکس نافذ کرنے کا قانون بنائے جیسا کہ 1986ء تک موجود تھا۔ تب اس کی ٹیکس کی شرح پانچ فیصد سے شروع ہوتی تھی اور 20 فیصد تک بلند ہو جاتی تھی۔ پراپرٹی پر ٹیکس کی تجویز کو موثر بنانے کے لیے کچھ اقدامات ضروری ہیں۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ عام طور پر بیعانہ کے اقرار نامہ اور فروخت کی دستاویز کے درمیان قیمت کا فرق ہوتا ہے۔ بیعانہ میں عام طور پر صحیح قیمت درج کی جاتی ہے مگر فروخت کی دستاویز میں وہ قیمت دکھائی جاتی ہے جو ڈی سی او کی طرف سے متعین کی گئی ہوتی ہے، وہ عام طور پر بازار کے ریٹ سے کم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں تجویز ہے کہ یہ قانونی پابندی عاید کی جائے کہ بیعانہ کا اقرارنامہ بھی اُسی طرح رجسٹر ہوا کرے، جس طرح فروخت کی دستاویز رجسٹر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں رجسٹریشن ایکٹ 1908ء میں ترمیم درکار ہوگی۔ دوسری تجویز ہے کہ رجسٹرار بیعانہ کے اقرار نامہ کی ایک نقل محکمہ انکم ٹیکس کو ارسال کرے۔

تیسری تجویز کا تعلق ڈی سی او کے مقرر کردہ پراپرٹی کی ویلیو کے اعلان نامہ سے ہے۔ ڈی سی او اعلان نامہ ہر سال جاری نہیں کرتا۔ دیکھا گیا ہے کہ پراپرٹی کی قیمتوں میں کئی بار اُبھار آیا، جبکہ ڈی سی او کے مقرر کردہ ریٹ پرانی سطح پر جامد رہ گئے۔ اس سقم کی وجہ سے فروخت کی دستاویزات بازار کے نرخ کے مقابلے میں کم مالیت کے مطابق تحریر ہوئیں، یہ بات کالے دھن کے فروغ کا باعث بنی اور حکومت کو بھی سٹیمپ ڈیوٹی اور کیپٹل ویلیو ٹیکس کم وصول ہوا۔ صوبائی حکومتوں کو پابندی عاید کرنی چاہیے کہ ڈی سی او ہر سال اور اگر ضروری ہو تو سال میں ایک سے زیادہ بار پراپرٹی کی ویلیو کا تعین کرے۔

III

12۔ ہمارا انکم ٹیکس کا قانون ان افراد پر خصوصی عنایت فرماتا ہے جو دولت کی بنیاد پر دولت کماتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اچھل دولت کا بڑا وسیلہ سٹاک ایکسچینج ہے۔ سٹاک ایکسچینج کے ذریعے کمپنی شیرز کی خرید و فروخت سے کروڑوں اور اربوں روپے کا منافع حاصل کرنے والوں پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوا۔ ہمارے یہاں اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے کمپنی کے حصص فروخت کرنے والے کے منافع پر کیپٹل گین ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا۔ البتہ خریدار پر 0.02 فیصد کے حساب سے کیپٹل ویلیو ٹیکس نافذ ہے، جو خریدار قیمتِ خرید کے حوالے سے ادا کرتا ہے۔ خیال رہے کہ انکم ٹیکس کے آرڈیننس کے سیکشن 37 کے تحت حصص کے فروخت سے حاصل ہونے والے کیپٹل

گین پر ٹیکس وصول کرنے کی گنجائش موجود ہے، مگر اس سیکشن کا اطلاق 2010ء تک روک دیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ سٹاک ایکسچینج کے ذریعہ شیرز پر کیپٹل گین 1979ء سے معاف چلا آ رہا ہے۔

13۔ مذکورہ کیپٹل گین کا تعطل ایک وجہ ہے کہ سٹاک ایکسچینج سٹہ بازوں کا ایک اڈا بن گیا۔ 2008ء کے عالمی معاشی بحران سے قبل حصص کی قیمتیں بہت اونچی چلی گئی تھیں، جسے سٹاک ایکسچینج کے بروکر معاشی ترقی کا انڈیکس قرار دیتے رہے، جو صحیح نہیں تھا۔ سٹاک ایکسچینج کا بڑا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کے حصص مارکیٹ میں بیچ کر کمپنیوں کے لیے سرمایہ اکٹھا کرے اور پہلے سے موجود کمپنیوں کے حصص کی چھوٹے سرمایہ کاروں کے ہاتھوں فروخت کر کے حصص کی ملکیت کی توسیع کرے۔ معیشت کی ترقی کا حقیقی ثبوت یہ نہیں کہ سٹاک ایکسچینج کا انڈیکس کتنا اونچا ہے، بلکہ یہ ہے کہ صنعتی معیشت جو اشیاء تیار کرتی ہے، وہ تیکنیکی اعتبار سے کتنی اعلیٰ اور اونچی مالیت کی ہیں اور برآمد سے کتنا زیادہ زرِ مبادلہ کماتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے ہماری صنعتی معیشت پسماندہ ہے۔

IV

14۔ بغیر محنت کے آمدن کی کئی صورتوں مثلاً کرایہ، ڈیوڈنڈ اور سود کو مفروضہ ٹیکس کے زمرے میں شامل کر کے فکسڈ شرح (جو زیادہ سے زیادہ دس فیصد ہے) کے مطابق وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح مالدار اور سماجی طاقت کے حامل افراد جن کے

دوسرے ذرائع بھی ہیں، رعایت حاصل کر لیتے ہیں۔ خیال رہے کہ معمول کی شرح 25 فیصد تک بلند ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ افراد جن کے دوسرے ذرائع آمدن نہیں یا ان ذرائع سے آمدن تھوڑی ہے ان سے فکسڈ شرح سے ٹیکس وصول کر لیا جاتا ہے۔ جب کہ ممکن ہے کہ اگر معمول کے شیڈول کا اطلاق ہوتا تو ٹیکس کی مقدار صرف پانچ فیصد ہوتی یا ٹیکس سرے سے عائد نہ ہوتا۔

15۔ جب ملک مشکل میں پھنس جائے تو سرمایہ کار مجبوری سے فائدہ اُٹھانے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً ملک بجلی کے جس بحران میں گرفتار رہا اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے 1986ء کے بعد نئے بجلی گھر نصب کرنے والی کمپنیوں نے ٹیکس معافی حاصل کر لی۔

16۔ قانونی مراعات حاصل کرنے والا ایک طبقہ ملازمت پیشہ (سرکاری اور غیرسرکاری) ہے۔ بہت سے سرکاری حکام طرح طرح کے ٹیکس فری الاؤنس لیتے ہیں۔ 2006ء میں نجی شعبے کے ملازمین کے الاؤنسوں پر ٹیکس عاید کیا گیا۔ مگر تنخواہ پر عائد انکم ٹیکس کی شرح تجارت پیشہ ٹیکس گزاروں کی نسبت کم رکھی گئی۔ اس رعایت سے فائدہ بڑی بڑی کمپنیوں اور بنک ملازمین کو حاصل ہوتا ہے جن کا مشاہرہ بہت اونچا ہوتا ہے۔

17۔ انکم ٹیکس آرڈیننس کی دفعہ 111 کے مطابق جب کسی ٹیکس گذار کے اثاثے اس کے قانونی وسائل سے زیادہ ہوں تو زائد اثاثوں کی مالیت پر ٹیکس اور جرمانہ عاید ہوگا اور قید کی سزا ہوگی۔ ہمارے یہاں بہت سے بڑے لیڈروں کی

کرپشن کے قصے زبانِ زد عام ہیں۔ ان کے پاس کروڑوں اربوں کے ناجائز اثاثے موجود ہیں، ٹیکس حکام ان کے خلاف ایکشن لینے کی ہمت نہیں رکھتے۔ 2004ء میں حکومتِ پاکستان نے یہ قانون بنایا کہ متعین مدت (پانچ سال) تک ناجائز اثاثے محکمہ انکم ٹیکس سے چھپا رکھنے والے افراد سے پوچھ گچھ نہیں کی جا سکے گی۔ دوسرے معنی میں ان پر ٹیکس یا جرمانہ نہ لگے گا۔ اس رعایت کا اطلاق کم از کم اُن افراد پر نہیں ہونا چاہیے جن پر رشوت ستانی اور غبن کے الزامات ہوں۔ حکمران طبقہ کے افراد جو قوم کی رہبری کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کا دامن شفاف ہونا چاہیے۔

18۔ پاکستانی افواج نے ٹرسٹ قائم کیے جنہوں نے متعدد صنعتی اور کاروباری ادارے بنائے۔ ان اداروں کی ساری آمدن 1993ء تک انکم ٹیکس سے مستثنیٰ رہی۔ بعد ازاں ان کی آمدن کا صرف وہ حصہ جو فلاحی مقاصد کے لیے صرف ہو، ٹیکس سے معاف ہے۔ یہ رعایت اصولاً دوسرے حکومتی محکموں کے ٹرسٹوں کے کاروباری اور صنعتی اداروں کے لیے بھی ہے مگر عملاً پولیس کے علاوہ شاید ہی کسی سرکاری محکمہ نے ایسے ٹرسٹ ادارے قائم کیے ہیں۔ پولیس ٹرسٹ کا کاروباری ادارہ بھی بڑا نہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں ان مراعات پر تنقید کی گئی ہے جو نامناسب ہیں۔ خیال رہے کہ بعض مراعات جائز ہوتی ہیں مثلاً جن کا مقصد تعلیم کا فروغ ہو، برآمدات میں اضافہ ہو یا جن کا مقصد نالج اکانومی کا فروغ ہو۔ یہ اقدامات معاشرہ اور معیشت کو جدید بنانے میں مددگار ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ناجائز مراعات کیسے ختم ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے

لیے قانون سازی کی ضرورت ہے۔ جڑواں سوال ہے کہ کیا قانون ساز اداروں میں کبھی ایسے نمائندے اکثریت میں ہوں گے کہ مطلوبہ ترامیم کر سکیں۔ معاشرے کی موجودہ ساخت کے پیشِ نظر یہ کام آسان نہیں۔ مزید مشکل یہ ہے کہ اچھے قانون اگر بن بھی جائیں، ان پر شفاف طریقہ سے عمل کیسے یقینی بنے۔ ظاہر ہے کہ ایک سماجی معاملہ دوسرے سماجی معاملہ سے جڑا ہوا ہے۔ معاشرے کی کارکردگی اسی وقت بہتر ہوگی جب معاشرہ مجموعی طور پر صحت مند ہوگا۔ گویا مسئلہ معاشرہ کو مجموعی اعتبار سے ریفارم کرنے کا ہے۔ تو کیا کسی انفرادی معاملہ کو نظر سے اوجھل کر دینا چاہیے۔ ایسا نہیں۔ انفرادی مسئلہ حل کیا جانا چاہیے۔ البتہ معاشرہ کی اصلاح کا مقصد اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ انفرادی مسئلہ کا حل مجموعی اصلاحی پروگرام کا حصہ ہو۔

پرچون فروشوں کا مسئلہ

پہلے ذکر آ چکا کہ انکم ٹیکس کا 68 فیصد لمیٹڈ کمپنیاں، 4 فیصد ملازمت پیشہ افراد اور بقایا 28 فیصد دوسرے سب شعبوں سے تعلق رکھنے والے ٹیکس گزار ادا کرتے ہیں۔ ان میں پرچون فروش، تھوک فروش، امپورٹر، ٹرانسپورٹر، کمیشن ایجنٹ، سپلائر، ٹھیکیدار، ڈاکٹر، وکلا اور چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ وغیرہ شامل ہیں۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد جو ریٹرن یا سٹیٹمنٹ داخل کرتے ہیں تقریباً 19 لاکھ ہیں۔ ایسے ٹیکس گزار جو لازمی ٹیکس کٹوتی کی قانونی زد میں نہیں آتے، وہ عام طور پر واجب الادا ٹیکس پورا جمع نہیں کراتے۔ واقفِ حال لوگ جانتے ہیں کہ بیشتر تاجروں کے پاس کسی نہ کسی شکل میں حساب کتاب موجود ہوتا ہے۔ مگر وہ یہ بات محکمہ کے سامنے تسلیم نہیں کرتے۔ اگر مکمل حساب کتاب نہ ہو تو بھی بینک اکاؤنٹ، ذاتی اخراجات اور اثاثوں کی مدد سے ٹیکس چوری روکنا ناممکن نہیں۔ مشکل وہاں ہوتی ہے کہ جب محکمہ ٹیکس اس سلسلہ میں سخت گیر قدم اُٹھائے تو حکومت اور سیاسی جماعتیں، ٹیکس گزاروں کے ردِّعمل سے خوف کھا کر اسے روک دیتی ہیں۔

یہاں پرچون فروشوں کے ٹیکس معاملہ پر غور کیا جائے گا۔ پرچون فروش لاکھوں میں ہیں اور متوسط طبقے کے ٹیکس کلچر کے عکاس ہیں۔ ٹیکس گریزی کی بنیادی

وجوہ میں دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ پہلی بات کا تعلق معاشرے کے تہذیب و تمدن سے ہے اور دوسری بات کا تعلق آدمی کے دولت کے بارے میں رویہ سے ہے۔ عام شخص ہاتھ آئی دولت بخوشی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔ کوئی معاشرہ ٹیکس وصولی میں بڑی کامیابی حاصل نہیں کیا کرتا جب تک وہ قانون پر موثر عملدرآمد کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ جوں جوں معاشرہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ترقی پاتا اور منصفانہ نظام کی جانب پیشرفت کرتا ہے، قانون کا احترام بڑھ جاتا ہے اور نتیجتاً ٹیکس وصولی بھی بڑھ جاتی ہے۔ پاکستان میں قانون کے احترام کا رویہ کمزور ہے اور قانون کی طاقت بھی موثر نہیں۔

پرچون فروشوں نے معمول کے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کے قواعد کے مطابق عملدرآمد سے بار بار انکار کیا ہے۔ حکومت نے ان کے لیے ٹیکس پالیسی میں کئی بار تبدیلیاں کیں۔ یہاں جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے، وہ جولائی 2007ء سے نافذ العمل ہے۔ اس قاعدہ کے مطابق پرچون فروشوں کی تین کیٹگری کی گئی ہیں۔ پہلی کیٹگری اُن پرچون فروشوں کی ہے جن کی سالانہ بکری پچاس لاکھ روپے تک ہے۔ دوسری کیٹگری میں وہ پرچون فروش ہیں جن کی بکری پچاس لاکھ سے ایک کروڑ روپیہ ہے اور تیسری کیٹگری میں ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ بکری والے ہیں۔ پہلی کیٹگری کے پرچون فروشوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ معمول کا آمدن کا گوشوارہ داخل کریں اور اس کے مطابق انکم ٹیکس جمع کرا دیں۔ بصورتِ دیگر انہیں یہ اختیار ہے کہ ٹرن اوور کی بنیاد پر 0.50 فیصد کے حساب سے فکسڈ ٹیکس ادا کر دیں۔ اس صورت میں صرف

بکری کا اعلان کافی ہوتا ہے۔ اس کیٹگری کے پرچون فروشوں پر سیلز ٹیکس عائد نہیں۔ 2008ء میں اس کیٹگری کے 42,000 پرچون فروشوں نے معمول کے انکم ٹیکس کے گوشوارے داخل کیے اور 22,000 پرچون فروشوں نے 0.50 فیصد کے حساب سے ٹرن اوور ٹیکس ادا کیا۔

دوسری کیٹگری کے پرچون فروشوں (ٹرن اوور 50 لاکھ تا ایک کروڑ) کے لیے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کی مجموعی شرح ایک فیصد مقرر ہے جو ٹرن اوور پر نافذ ہے۔ تیسری کیٹگری (ٹرن اوور ایک کروڑ سے زائد) کے لیے دونوں ٹیکسوں کی مجموعی شرح ڈیڑھ فیصد مقرر ہے۔ دوسری اور تیسری کیٹگری کے پرچون فروشوں کو اختیار نہیں کہ وہ معمول کی آمدن کا گوشوارہ داخل کریں۔ ان پر یہ قانونی پابندی ہے کہ وہ ٹرن اوور پر فکسڈ شرح سے ٹیکس ادا کریں۔ جہاں تک ٹرن اوور کا تعلق ہے، محکمہ کے پاس کوئی پیمانہ موجود نہیں جس کے ذریعے وہ تصدیق کر سکے کہ بکری کی صحیح رقم کیا ہے، کیونکہ تاجروں میں کیش میمو جاری کرنے کا قائدہ رائج نہیں۔ فکسڈ شرح کا اطلاق لمیٹڈ کمپنیوں پر نہیں ہوتا۔ کچھ اشیاء بھی فکسڈ ٹیکس کے زمرے سے باہر رکھی گئی ہیں۔ مثلاً موٹر وہیکلز اور الیکٹریکل اشیاء۔ ایسی اشیا کے پرچون فروشوں کے لیے معمول کے گوشوارے داخل کرنے کا قانون ہے۔

ٹرن اوور ٹیکس کے نفاذ نے ٹیکس چوری کی ترغیب دی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں پرچون فروش موجود ہیں جن کی بکری 50 لاکھ سالانہ سے کہیں زیادہ ہے مگر وہ اپنی ٹرن اوور پر اونچی شرح سے ٹیکس ادا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جن

پرچون فروشوں نے 50 لاکھ روپے سالانہ سے زائد بکری ڈیکلیئر کی اُن کی تعداد 800 ہے۔ اس بات کو ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ (لمیٹڈ کمپنیوں کے علاوہ) ملک بھر میں صرف 800 پرچون فروش ایسے ہیں جنہوں نے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کے طور پر 25,000 روپے سالانہ سے زیادہ ادا کیے۔ یہ تعداد حیرت ناک حد تک کم ہے۔ ہر بازار، گلی، محلے اور گاؤں میں صارفین کی ضروریات کے لیے بے شمار دکانیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر دودھ دہی، پھل، سبزی، پرویژن (آٹا، دالیں، گھی، صابن، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ)، مٹھائی، گوشت، گارمنٹس، ہوزری، کپڑا، جوتے، بیکری، آئس کریم، کتب، سٹیشنری، ادویات، سپیئر پارٹس، ہارڈ ویئر، کیمیکل، جیولری، منیاری، کھاد، ٹمبر، تعمیراتی سامان، فرنیچر، سامانِ آرائش۔ ایسی اشیا کی دکانیں لاکھوں ہیں۔ ان میں سے اکثر کی ماہانہ بکری 420,000 روپے سے زیادہ ہے۔

سرکاری طور پر صنعتی اور تجارتی یونٹوں کے اعداد و شمار اکٹھے کیے گئے۔ یہ کام جنوری 2004ء میں تکمیل پایا۔ اس معاشی شماریات (Economic Census) کے مطابق پرچون فروش، تھوک فروش، ہوٹل اور ریسٹوران کو ایک کلاس قرار دیا گیا۔ اس میں شامل کل ادارے (Establishments) 15,66,722 ہیں۔ ان میں بیشتر پرچون فروش ہیں۔ اس روشنی میں پرچون فروش جو انکم کی ریٹرن یا بکری سٹیٹمنٹ داخل کرتے ہیں تقریباً 4 فیصد ہیں۔

ٹیکس فری شاید ہی کوئی دکاندار ہو، جو دکاندار بجلی استعمال کرتا ہے۔ اس سے بجلی کے بل کے ساتھ انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے جس کی کم سے کم رقم 720

روپے سالانہ ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی فون کے بل کے ساتھ اور بنک سے رقم نکلوانے پر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ ٹیکسوں کی ان رقوم کو حکومت ضبط کر لیتی ہے یعنی اس کا کریڈٹ نہیں دیتی۔ یہ بات تاجر کو گوشوارہ یا سٹیٹمنٹ داخل کرنے سے گریز کی ترغیب دیتی ہے۔ وہ جائز طور پر معترض ہے کہ اُس سے دوہرا ٹیکس لیا جا رہا ہے۔ ایک بار بجلی اور ٹیلی فون کے بل وغیرہ کے ہمراہ اور دوسری بار آمدن یا بکری کی بنیاد پر۔ حکومت کا فیصلہ اصول پر مبنی نہیں۔ غالباً یہ تاجروں کے رویہ کا ردِعمل ہے کہ بہت سے تاجر معمول کے گوشوارہ میں صرف اتنی آمدن دکھایا کرتے تھے کہ ٹیکس اس رقم سے زائد نہ ہو جو بجلی اور ٹیلیفون کے محکمے اور بنک وصول کر چکے ہیں۔ تاجر کی بے اصولی کا جواب حکومت نے بھی ٹیکس ایڈجسٹمنٹ کا مسلمہ اصول توڑ کر دیا۔ حکومت ٹیکس کی وصولی بڑھانے کے لیے منصفانہ اصول ترک کرتی جا رہی ہے۔ کیا اس طریقِ کار سے ٹیکس کا بحران حل ہو سکے گا؟

پرچون فروش اپنی آمدن کے جو گوشوارے یا بکری کی سٹیٹمنٹ داخل کرتے ہیں، عام طور پر اُن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ عملاً ہو یہ رہا ہے کہ ٹیکس گزار اپنے ذاتی لازمی اخراجات کا تخمینہ لگاتا ہے۔ ان اخراجات کو سامنے رکھ کر وہ آمدن اور بکری کا تخمینہ لگاتا ہے۔ گوشوارے یا سٹیٹمنٹ اس تخمینے کی بنیاد پر بھر لیے جاتے ہیں۔ گویا آمدن اور بکری جو ڈیکلیئر کیے جاتے ہیں، فرضی ہوتے ہیں۔

ٹیکس چوری روکنے کے لیے لازمی ہے کہ معیشت کی ڈاکومنٹیشن ہو۔ مگر ہو کیسے؟ جس معاشرے میں بجلی چوری ہو، جہاں منبع پر وصول کی گئی ٹیکس کی رقم کا

کریڈٹ نہ ملے، جہاں امپورٹ کی انڈر انوائسنگ ہو، جہاں سمگل شدہ اشیاء کھلے بازار بکیں، جہاں حق لینے کے لیے رشوت دینی پڑے، جہاں سپلائی اور کنٹریکٹ کے کاروبار کرپشن پر قائم ہوں، جہاں سرکاری عملے کا مشاہرہ جائز اخراجات پورا نہ کرے، جہاں انصاف بکتا ہو، جہاں سیاست دانوں کی کرپشن کے قصے زبان زد عام ہوں، وہاں سوائے چند شعبوں کے معیشت کی ڈاکومنٹیشن نہیں ہوا کرتی۔ تصویر کا دوسرا رُخ بھی صحیح ہے کہ جب تک ڈاکومنٹیشن نہیں ہوگی، صورتِ حال کی اصلاح نہیں ہوگی۔ اصلاح کا پُرامن طریقہ یہ ہے کہ انتخابات شفاف ہوں، اعلیٰ عدلیہ شفاف ہو، محاسبہ کا نظام موثر ہو، حکومت کے نظام میں شفافیت ہو، اسی صورت معیشت کی ڈاکومنٹیشن کے لیے حالات سازگار ہوں گے۔ آخری دو ابواب میں اصلاح کی تجاویز پر غور کیا گیا ہے۔

کچھ بات ٹیکس نظام کے حوالے سے ہو جائے۔ انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کے قوانین ہر تاجر اور صنعتکار کو پابند کرتے ہیں کہ وہ اپنی خرید، فروخت اور سٹاک کا ریکارڈ رکھے۔ تاجر اور صنعتکار کے لیے لازمی ہے کہ وہ فروخت شدہ مال کے بارے میں گاہک کو کیش میمو یا بل جاری کرے۔ اب تضاد ملاحظہ ہو۔ ایک جانب قانون کی پابندی ہے کہ حسابات رکھے جائیں دوسری جانب ہمارے فیڈرل بورڈ آف ریونیو نے محکمانہ طور پر یہ رعایت دے رکھی ہے کہ ٹیکس گزار جو مفروضہ ٹیکس کے زمرے میں آتے ہیں، مثلاً کنٹریکٹرز، باقاعدہ حساب کتاب رکھنے کے پابند نہیں۔ ہمارے یہاں نئی روایت قائم ہوگئی ہے، جس کی رُو سے ہر تاجر اور صنعت کار کو

(سوائے لمیٹڈ کمپنیوں کے) یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ اپنی آمدن کے گوشوارے کے ساتھ نفع نقصان کا تفصیلی اکاؤنٹ اور بیلنس شیٹ منسلک نہ کریں۔ شاید ہی کوئی ذمہ دار ریاست ہوگی جو ٹیکس گزاروں کو اس نوعیت کی رعایت دیتی ہو۔ یہی بات ٹیکس چھپانے کی ایک بڑی ترغیب ہے۔

ٹیکس کی شرح اور معاشرتی تقاضے

کوئی معاشرہ خرابیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ افسوسناک صورت تب ہوتی ہے جب معاشرہ اصلاح کی صلاحیت کھو دے۔ ہمارے یہاں جو طبقات سماجی حیثیت کے مالک رہے ہیں، اُنہوں نے اصلاح نہیں کی، حالات بگاڑے ہیں۔ بااثر طبقات نے مراعات حاصل کی ہیں، قومی وسائل لوٹے ہیں۔ بڑے زمینداروں کے طبقہ نے ٹیکس دینے سے انکار کیا ہے۔ تاجر حساب کتاب پیش کرنے سے منکر ہوئے ہیں، ان حالات میں وفاقی حکومت کے ماہرین نے ٹیکس وصولی کے لیے نیا ہتھکنڈا اختیار کیا۔ میرا اشارہ مفروضہ (Presumptive) ٹیکس کی جانب ہے۔ مناسب یہ ہے کہ یہاں ٹیکس وصول کرنے کا معمول کا طریقہ بیان کر دیا جائے۔ معمول کا اصول یہ ہے کہ انکم ٹیکس کی شرح مقرر کرتے وقت ٹیکس گزار کی آمدن اور مالی پوزیشن کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ زیادہ آمدن والوں سے اونچی شرح سے، متوسط آمدن والوں سے نسبتاً کم شرح سے، تھوڑی آمدن والوں سے مزید کم شرح سے ٹیکس وصول کیا جائے۔ اکثر ممالک ایک حد سے کم آمدن والوں پر کوئی ٹیکس عاید نہیں کرتے۔ مفروضہ ٹیکس اس اصول پر پورا نہیں اُترتا۔ مفروضہ ٹیکس آمدن کی جس

کیٹگری پر نافذ ہو جائے اس کے سب ٹیکس گزاروں سے یکساں فلسڈ شرح سے ل کیا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کی آمدن کتنی ہے، دس لاکھ ہے یا دس ہزار روپیہ۔ کرایہ، سپلائی، کنٹریکٹ، خدمات کا معاوضہ اور درآمدی مال، سود، ڈیوڈنڈ، کمیشن کی آمدنوں پر ٹیکس فلسڈ شرح سے وصول کیا جاتا ہے۔ یوں زیادہ آمدن والے ٹیکس گزار جس سے اونچی شرح سے ٹیکس وصول ہونا چاہیے، اور کم آمدن والا جس پر ٹیکس سرے سے نافذ نہیں ہونا چاہیے، سے یکساں شرح سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ گویا مفروضہ ٹیکس کے نفاذ سے امیر کے حصہ کا ٹیکس غریب ادا کرتا ہے۔

سپلائی، درآمدی اشیا، کنٹریکٹ کی مالیت پر مفروضہ ٹیکس بالواسطہ نوعیت کا ہے، جو اشیا اور کنٹریکٹ کی لاگت بڑھا دیتا ہے۔ تاجر بڑھی ہوئی لاگت صارف سے وصول کر لیتا ہے۔ اس طرح ٹیکس تاجر کی بجائے صارف برداشت کرتا ہے۔ گویا ان کیٹگری کے تاجروں کی آمدن پر سرے سے کوئی ٹیکس عائد نہیں اور صارف مہنگائی کا سامنا کرتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مفروضہ ٹیکس کو انکم ٹیکس کا نام کیوں دیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ اسے بجٹ دستاویزات میں ڈائریکٹ ٹیکس کی مد میں شمار کیا جائے۔ اس طریقہ سے انڈائریکٹ ٹیکسوں (سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی) کے نفاذ کا جواز موجود رہتا ہے اور عام صارفین کو دھوکا دیا جا سکتا ہے کہ صرف وہ ہی نہیں بلکہ تاجر اور صنعت کار بھی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

مفروضہ ٹیکس کی شرحیں مندرجہ ذیل ہیں:

ڈیوڈنڈ اور سود	10 فیصد،
کمرشل امپورٹ	2 فیصد،
ایکسپورٹ	1 فیصد،
سپلائی	3.5 فیصد،
کنٹریکٹ اور سروسز	6 فیصد،
بروکریج اور کمیشن	10 فیصد،
کرایہ	5 تا 10 فیصد۔

بھارت میں مفروضہ ٹیکس نافذ نہیں۔ کوئی جمہوریت پسند ملک اس پیمانے پر مفروضہ ٹیکس نافذ کرنہیں سکتا جس پیمانہ پر ہم نے کیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل بھارت نے شراب بیچنے اور جنگل کاٹنے کے شعبوں پر اس کا نفاذ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کاروبار کرنے والوں کا مستقل اتا پتا نہیں ہوتا۔ انڈیا کی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ ان شعبوں کے کاروباری افراد کو بھی موقع دیا جانا چاہیے کہ وہ ٹیکس آمدن کی بنیاد پر معمول کے مطابق دیں۔ یہ بات ہم پاکستانیوں کو اپنا گریبان جھانکنے کی دعوت دیتی ہے کہ ہم نے مسلمہ اصولوں کو پامال کر کے ایک غیر منصفانہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے خلاف کوئی سیاسی پارٹی اور سماجی تنظیم آواز نہیں اُٹھاتی۔ بلکہ ہمارے تاجر مصر ہیں کہ اس نظام کو برقرار رکھا جائے۔ خیال رہے کہ ہماری سپریم کورٹ نے مفروضہ ٹیکس کو جائز قرار دے رکھا ہے۔

II

2007ء سے ہمارے یہاں تمام کمپنیوں پر انکم ٹیکس کی شرح 35 فیصد مقرر ہے۔ اس سے پہلے پرائیویٹ کمپنیوں اور بنکوں پر شرح پبلک لمیٹڈ کمپنی کی نسبت زیادہ ہوتی تھی۔ (چھوٹی کمپنی پر شرح کم ہے) کمپنیوں کے احاطہ سے باہر تجارتی اور صنعتی افراد یا اداروں کے لیے ٹیکس کی شرح نصف فیصد سے شروع ہوتی ہے اور 25 فیصد تک بلند ہو جاتی ہے۔ بلند ترین شرح 13 لاکھ کی آمدن پر نافذ ہوتی ہے۔ البتہ تنخواہ دار افراد کے لیے ٹیکس کی شرح کم رکھی گئی ہے۔ تنخواہ داروں کے لیے اونچی ترین شرح 20 فیصد ہے جو 86.5 لاکھ سے اوپر تنخواہ پر نافذ ہوتی ہے۔ اس طرح تنخواہ داروں سے ترجیحی سلوک کیا گیا ہے۔ حکومت کی پالیسی ہے کہ بڑی بڑی لمیٹڈ کمپنیوں کے اعلیٰ ملازمین کو خصوصی رعایت دی جائے اور یوں بڑی کمپنیوں کا معیشت میں کردار بڑھایا جائے۔

کارپوریٹ سیکٹر سے باہر تجارتی اداروں کے لیے اونچی سے اونچی شرح 25 فیصد ہے۔ یہ شرح کمپنی کے لیے مقرر شرح سے کم ہے۔ عام طور پر افراد یا ادارے جو 25 فیصد کی شرح سے ٹیکس ادا کرتے ہیں حجم میں بہت بڑے نہیں ہوتے، انہیں یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اپنی ہیئت کو چھوٹی کمپنیوں میں متشکل کر لیں۔ چھوٹی کمپنیوں کے لیے انکم ٹیکس کی شرح 20 فیصد ہے۔ یہ شرح ایسی کمپنیوں کے لیے ہے جن کے ادا شدہ سرمایہ اور ریزرو کی مجموعی رقم اڑھائی کروڑ روپیہ سے کم

ہے اور سالانہ بکری 20 کروڑ روپے سے زائد نہیں۔ پہلے سے موجود چھوٹی کمپنیوں کو یہ رعایت نہیں دی گئی جو نا قابلِ فہم تفریق ہے۔ اگر کسی کمپنی نے نقصان کیا یا اس کا منافع ٹیکس سے معاف ہے تو ان سے ٹیکس وصولی کا متبادل نظام ہے یہ کہ اس کی فروخت یا گراس وصولیوں پر نصف فیصد کے حساب سے مفروضہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔

بھارت میں کمپنیوں کے لیے انکم ٹیکس ریٹ 30 فیصد ہے۔ سرچارج اور ایجوکیشن سس شامل کر کے موثر شرح 33.99 فیصد ہو جاتی ہے۔ اگر حساب کتاب کے مطابق منافع کے مطابق ٹیکس 10 فیصد سے کم رہے تو متبادل ٹیکس واجب ہو جاتا ہے جس کی موثر شرح 11.33 فیصد سے کم نہیں۔ (حساب کتاب کے مطابق منافع کی نسبت سے ٹیکس کی رقم 10 فیصد سے کم اس صورت میں ہوتی ہے جب الاؤنس اور مراعات دستیاب ہوں۔) بھارت میں افراد پر انکم ٹیکس کی شرح پاکستان سے بلند 30 فیصد ہے۔ دس لاکھ سے زائد آمدن پر 10 فی صد سرچارج بھی نافذ ہوتا ہے۔ اس طرح انکم ٹیکس کی مجموعی رقم 30% سے بڑھ کر 33% ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ٹیکس کی رقم پر 3 فیصد کے حساب سے ایجوکیشن سس عائد ہوتا ہے۔ وہاں تاجر اور ملازمت پیشہ افراد کے ٹیکس ریٹ میں فرق نہیں۔

پاکستان اور بھارت دونوں ممالک میں ایکسپورٹ زون میں واقع صنعتوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ پاکستان نے سوائے نجی بجلی گھروں کے دوسرے شعبوں میں ٹیکس ہالیڈے ختم کر دی ہے البتہ پسماندہ علاقوں میں چند مخصوص ٹیکس

مراعات روا رکھی گئی ہیں۔ بھارت میں متعدد شعبوں میں ٹیکس ہالیڈے جاری ہے مثلاً پہاڑی اور سپیشل ٹیرف ایریا میں واقع صنعتوں کو ٹیکس ہالیڈے حاصل ہے۔ بھارت میں پہاڑی علاقوں میں ٹورازم کی ترویج کے لیے ہوٹل کی آمدن ٹیکس سے مستثنیٰ ہے اور ٹیلی کمیونیکیشن، بجلی اور سڑکوں کے شعبوں میں بھی ٹیکس ہالیڈے دی گئی ہے۔

III

بھارتی نظام سے تقابلی جائزہ ہمارے لیے فکر کی راہیں کھول سکتا ہے۔ بھارت کی بلیک اکانومی کا حجم رپورٹ شدہ معیشت (Reported Economy) کے 33 فیصد کے برابر ہے جسے وہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا عزم ہے کہ وہ معیشت کو ڈاکومنٹ کرے گا۔ یہ بات اس قانون سے ظاہر ہے جس کی رُو سے ٹیکس گزار اپنے حسابات چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے آڈٹ کرانے کا پابند ہے جس کی سالانہ بکری 40 لاکھ روپے ہے۔ اس آڈٹ رپورٹ کو محکمۂ انکم ٹیکس عام طور پر تسلیم کر لیتا ہے۔ آڈٹ کا قاعدہ انڈونیشیا میں بھی رائج ہے۔ ہمارے یہاں نہیں۔ یہاں حکومت اور سیاسی پارٹیاں تاجروں سے خائف ہیں۔ کیوں نہ ہوں کہ ان کے اپنے دامن صاف نہیں۔

بھارت میں ویلتھ ٹیکس مخصوص شعبوں کے لیے موجود ہے مگر وہ ریونیو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں رہا۔ البتہ اس ٹیکس کو اس ترغیب کے طور پر قائم رکھا ہے کہ مالدار افراد اپنے اثاثے منافع بخش طور پر استعمال کریں۔ وہ مالدار افراد جو اپنے

اثاثوں کو بیکار رکھتے ہیں، انہیں 2 فیصد ٹیکس عائد کر کے مالی سزا دی جاتی ہے۔ اگر رہائشی مکان مالک کے ذاتی استعمال میں نہ ہو یا اُسے کرایہ کمانے کے لیے بھی استعمال نہ کیا جائے تو اس کی بازار کی مالیت کے مطابق ویلتھ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ زیورات پر بھی ٹیکس عائد ہے۔ یہ ٹیکس کمرشل عمارتوں اور کمپنی کے حصص پر عائد نہیں ہوتا، وجہ یہ کہ وہ معیشت کو فائدہ پہنچانے کا باعث ہیں۔

بھارت میں اسٹیٹ ڈیوٹی کا قانون منسوخ ہو چکا ہے۔ تاہم ترکہ کے بعض اثاثے حاصل کرنے والے وارثوں پر 10 فیصد کے حساب سے کیپیٹل گین ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اس ٹیکس سے زرعی املاک بھی مستثنیٰ نہیں۔ گویا زرعی اراضی کی وراثت کے ذریعے منتقلی پر بھی ٹیکس نافذ ہوتا ہے۔ (کیپیٹل گین ٹیکس معمول کے انکم ٹیکس کے قانون کے تحت وصول کیا جاتا ہے۔) پاکستان کی وفاقی حکومت زرعی اراضی پر ایسے کسی ٹیکس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔

بھارت میں گفٹ ٹیکس منسوخ ہو چکا ہے۔ چنانچہ گفٹ جو رشتہ دار کو دیا جائے اس پر یہ ٹیکس عائد نہیں۔ البتہ کسی دوسرے فرد کو دیا گیا گفٹ اس کی آمدن شمار کر کے انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ مقصد کالے دھن کو چھپانے کا راستہ روکنا ہے۔

بھارت میں زرعی آمدن پر انکم ٹیکس ماسوائے ریاست بنگال اور کیرالہ کے عائد نہیں، البتہ مرکزی حکومت زرعی آمدن کو ٹیکس کی شرح بڑھانے کے لیے ٹوٹل آمدن میں شامل کرتی ہے۔ کبھی یہ تجربہ پاکستان میں بھی کیا گیا جسے ہمارے حکمران

طبقات برداشت نہ کر سکے۔ پہلے تنخواہ دار افراد پر اس قانون کا اطلاق ختم کیا گیا، بعد میں قانون ہی کالعدم کر دیا گیا۔

IV

ہر قوم اپنے حالات، ضروریات اور مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ٹیکس کی شرح مقرر کرتی ہے۔ ٹیکس کی شرح میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ برطانیہ میں لمیٹڈ کمپنیوں کی آمدن پر سٹینڈرڈ ریٹ 28 فیصد ہے۔ چھوٹی کمپنیوں پر شرح ٹیکس 22 فیصد ہے۔ برطانیہ میں افراد پر ٹیکس کی شرح 40 فیصد تک بلند ہو جاتی ہے۔ سویڈن اور ناروے میں افراد پر ٹیکس کی شرح علی الترتیب 50 اور 51.3 فیصد ہے۔ کمپنیوں پر عاید ٹیکس کی شرح برطانیہ کے برابر 28 فیصد ہے۔ جاپان میں کمپنیوں پر ٹیکس کی شرح 25 فیصد ہے مگر افراد پر ٹیکس کی شرح 5 فیصد سے 40 فیصد تک ہے۔ جاپان میں سیلز ٹیکس کا نفاذ صرف پرچون فروشی کی سطح پر ہے اور محض 5 فیصد ہے۔ جاپان نے ٹیکس کا زیادہ بوجھ مالدار افراد پر ڈالا ہے، صارف پر کم۔ برطانیہ میں عام صارفین پر 15 فیصد کے حساب سے VAT عاید ہے۔ تاہم VAT کی شرح یکساں نہیں۔ مقامی ایندھن اور بجلی پر ٹیکس کی شرح 5 فیصد ہے۔ کئی اشیاء جیسے کھانے پینے کی چیزیں، بچوں کے کپڑے، ہر طرح کی کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر شرح صفر ہے۔

ناروے، سویڈن، ڈنمارک اور فن لینڈ (سکینڈ نیوین ممالک) میں افراد پر انکم ٹیکس کی شرح 60 تا 70 فیصد ہے۔ یہ ریاستیں جمہوری سوشلسٹ کہلواتی ہیں۔

اگرچہ یہاں پیداواری وسائل کی ملکیت نجی ہے لیکن سماج کے تمام طبقات کے لیے ترقی کے مواقع وسیع ہیں۔ سکینڈ نیوین ممالک میں سیلز ٹیکس کی سٹینڈرڈ شرح 25 فیصد ہے۔ تاہم بعض اشیاء کے لیے شرح اس ریٹ کی نصف بلکہ چوتھائی ہے۔ برطانیہ اور سکینڈ نیوین ممالک میں مالدار آدمی کے ترکہ پر وراثت ٹیکس (Inheritance Tax) عائد ہوتا ہے جو ورثا ادا کرتے ہیں۔

سکینڈ نیوین ممالک میں جب کسی تاجر کو نقصان ہو جائے تو حکومت سابقہ سالوں کا ٹیکس ریفنڈ کر دیتی ہے اور اسے دوبارہ پاؤں پہ کھڑے ہونے میں مدد دیتی ہے۔ حکومت کا رفاہی نظام موجود ہے جو بوڑھوں، بیماروں اور بیروزگاروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ بچے کی پیدائش پر والدین کو حکومت کی طرف سے الاؤنس دیا جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کا بندوبست نہایت عمدہ اور اعلیٰ ترین سطح تک فری ہے۔

ٹیکس نظام ہی ریاست کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ قابلِ ذکر پیمانہ پر فلاحی خدمت سرانجام دے۔ سکینڈے نیوین ممالک فلاحی فریضہ ادا کرنے میں سب سے آگے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ٹیکس کی قومی پیداوار سے شرح 40 فیصد سے زیادہ ہے۔ شرح اونچی اس لیے ہے کہ قومی پیداوار ایسی اشیا اور خدمات پر مشتمل ہے جو اونچی مالیت (Value Addition) کی حامل ہیں۔ وہاں پیداواری عمل جدید علوم اور ٹیکنالوجی پر منحصر ہے۔ وہ معاشرے تہذیب وتمدن کے اعتبار سے عرصۂ دراز سے صنعتی ہیں۔ وہاں یورپی نسل کا باشندہ عام طور پر جھوٹ اور منافقت سے کام نہیں لیتا۔ وہاں پیدا ہونے والے اور مرنے والے افراد کی تعداد تقریباً برابر

ہوتی ہے۔ یعنی مجموعی آبادی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ عام طور پر قومی آمدن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان وجوہ سے فی کس آمدن اونچی رہتی ہے اور اس قابل ہوتی ہے کہ اونچی شرح سے ٹیکس ادا کرے۔

مذکورہ بالا ملکوں کی معیشت دستاویزی (documented) ہے۔ وہاں انفراسٹرکچر بنانے کے لیے سرمایہ درکار نہیں۔ انفراسٹرکچر پہلے سے مضبوط ہے۔ نئی ضرورت نجی شعبہ پوری کر دیتا ہے۔ البتہ پسماندہ معیشتوں کا معاملہ پیچیدہ ہے۔ ان معیشتوں کا انفراسٹرکچر کمزور ہوتا ہے۔ اسے تعمیر کرنے کی ذمہ داری حکومت ادا کرتی ہے۔ اس کے لیے مالی وسائل درکار ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں انفراسٹرکچر کی تعمیر اور ترقیاتی مقاصد کے لیے انحصار قرضوں پر ہے۔

ٹیکس وصولی کا دار و مدار ریاست کی قوتِ ارادہ پر ہوا کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں قوتِ ارادہ کی بڑی کمی ہے۔ مصر نے اپنے سسٹم میں زبردست تبدیلی کی مثلاً کمپنیوں پر ٹیکس کی شرح 41 فیصد سے 20 فیصد کر دی مگر ساتھ ہی ٹیکس سے استثنیٰ کے دروازے بند کر دیے۔ یہ کام کرنے سے پہلے حکومت نے ٹیکس کے بارے میں خاموشی سے خفیہ معلومات اکٹھی کیں پھر اعلان کیا کہ ٹیکس چھپانے والوں کے خلاف زبردست تادیبی کارروائی ہوگی۔ ٹیکس گزاروں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ رضا کارانہ طور پر اپنے اثاثے ڈکلیئر کر دیں۔ اس پیکیج کے نتیجے میں ریونیو میں دوگنا اضافہ ہوا۔

ترقی پذیر ممالک میں سنگاپور کی ٹیکس کی شرح کم ہے۔ کمپنیوں کی آمدن پر

ٹیکس کی شرح 18 فیصد ہے۔ افراد کے لیے شرح ٹیکس 3 سے 20 فیصد ہے۔ سیلز ٹیکس کی شرح 7 فیصد ہے۔ کم شرح کی وجہ یہ ہے کہ وہاں آبادی کم مگر قومی پیداوار بہت ہے۔ ٹیکس کی شرح کم ہونے کے باوجود بھی ٹیکس بہت ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں انڈونیشیا کی آبادی کہیں زیادہ ہے۔ مگر وہاں کمپنیوں پر شرح ٹیکس میں بڑا فرق ہے۔ چھوٹی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے شرح 10 فیصد مقرر ہے۔ کمپنیوں کے لیے سٹینڈرڈ ریٹ 35 فیصد ہے۔ افراد پر ٹیکس کی شرح 5 تا 35 فیصد ہے۔ ترکی میں کمپنیوں پر ٹیکس کی شرح 20 فیصد ہے۔ افراد پر ٹیکس کی شرح 15 سے 35 فیصد ہے۔ مگر VAT کی شرح 18 فیصد ہے۔ ان دونوں ممالک میں حساب کتاب رکھنے کا کلچر پایا جاتا ہے۔

اکثر ترقی پذیر ممالک میں لمیٹڈ کمپنیوں کو ترقی کا انجن سمجھا جاتا ہے اور ان پر ٹیکس کی شرح اونچی رکھنے کا رجحان نہیں۔ اُبھرتا ہوا رجحان یہ ہے کہ معیشت کی پیداوار، اس کی کوالٹی اور مالیت (Value Addition) بڑھائی جائے۔ ٹیکس کی شرح کم رکھنے کے حق میں دلیل یہ ہے کہ اس طرح سرمایہ کاری اور پیداوار بڑھانے میں ترغیب ہوتی ہے۔ اب ترقی پذیر ممالک میں غیرملکی سرمایہ حاصل کرنے کے لیے زبردست مسابقت پائی جاتی ہے۔ یہ مسابقت ٹیکس کی شرح کو کم رکھنے اور ٹیکس ہالیڈے کی رعایت دینے کا باعث بنی ہے۔ غیرملکی سرمایہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ساتھ لاتا ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک چین اور بھارت نے ایسے ایکسپورٹ زون قائم کر رکھے ہیں جہاں قائم صنعتی کمپنیوں پر معمول کی شرح سے کہیں کم یا مکمل ٹیکس معافی

ہے۔ گویا ٹیکس کی شرح کے تعین میں بہت سے عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔ معاشرتی رویہ، سماج کی دیانت، ترقیاتی تقاضے، غیرملکی سرمایہ کاری کی ترغیب، ان سب عناصر کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

(اظہارِ تشکر: مغربی ممالک کے بارے میں معلومات کے لیے راقم نے انٹرنیشنل ٹیکسز کے ماہر ڈاکٹر اکرام الحق سے استفادہ کیا۔)

بالواسطہ ٹیکسوں کے حقائق

مالی سال 08-2007ء میں وفاقی حکومت کی اشیاء اور سروسز پر عائد ٹیکسوں (انڈائریکٹ ٹیکسز) کی مجموعی وصولی 617 ارب روپے تھی۔ سیلز ٹیکس کی رقم 375 ارب روپے (60.7%)، کسٹم ڈیوٹی 148 ارب روپے (23.9%)، اور فیڈرل ایکسائز 92 ارب روپے (14.9%) تھی۔ بالواسطہ ٹیکسوں کی ساخت میں 91-1990ء کے مقابلہ میں زبردست تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ تب بالواسطہ ٹیکس کی مجموعی رقم میں سیلز ٹیکس کی شرح 17.6 فیصد، کسٹم ڈیوٹی کی 54.9 فیصد اور سنٹرل ایکسائز کی 27.5 فیصد تھی۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ایسے بالواسطہ ٹیکس جو صنعتکار کی لاگت بڑھاتے ہیں (کسٹم ڈیوٹی اور سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی) کم کر دیے گئے ہیں، اور سیلز ٹیکس کا احاطہ بڑھا دیا گیا ہے جو صارف برداشت کرتا ہے۔ گویا ٹیکسوں کا رُخ پروڈکشن کی جانب سے Consumption کی جانب مڑ گیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ایکسائز ڈیوٹی کا مقصد بعض اشیاء مثلاً سگریٹ اور شراب کے استعمال کی حوصلہ شکنی ہوتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں مقصد ریونیو اکٹھا کرنا ہے۔ معمول کی ایکسائز ڈیوٹی کا نفاذ محدود اشیاء پر ہے۔ مگر 2007ء میں سپیشل ایکسائز ڈیوٹی کے نام پر مقامی پیداوار اور درآمدی اشیاء پر ایک فیصد کے حساب سے نئی ڈیوٹی نافذ

کر دی گئی ہے۔

کچھ عرصہ قبل ہمارے وفاقی ریونیو کا بڑا ذریعہ کسٹم ڈیوٹی تھی۔ اب ایسا نہیں۔ رائج کسٹم ڈیوٹی کا قانون اس اصول کے مطابق مرتب کیا گیا ہے کہ پیداواری ڈھانچہ اس قابل بنایا جائے کہ اس کی اشیا عالمی مارکیٹ میں مسابقت کر سکیں۔ اِس مقصد سے امپورٹ ڈیوٹی کی شرح کم کی گئی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی عالمی سکیم کے مطابق اسے آخرکار ختم کر دیا جائے گا، سوائے یہ کہ ڈمپنگ سے تحفظ مطلوب ہو۔

اب سیلز ٹیکس حکومت کے ٹیکس ریونیو کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہمارے یہاں سیلز ٹیکس کا نیا قانون 1990ء میں بنا۔ یہ قانون مشکلات سے دوچار ہے۔ اصولی طور پر یہ ٹیکس Value Added Tax (مختصراً VAT) کے پیٹرن پر بنایا گیا۔ VAT فروخت کی ہر سطح پر عائد ہوتا ہے۔ اشیا فروخت کرنے والا گاہک سے پورا ٹیکس وصول کر لیتا ہے، مگر قومی خزانے میں جمع کراتے وقت اتنے ٹیکس کا کریڈٹ لے لیتا ہے جو اس نے بوقتِ خرید ادا کیا ہوتا ہے۔ گویا نقد ٹیکس اضافی رقم پر عائد ہوتا ہے جو قیمتِ فروخت اور قیمتِ خرید کے مابین ہوتی ہے۔ اس اضافی رقم کو Value Addtion کہا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ نظام کامیابی سے چل رہا ہے، جاپان میں فروخت کی ہر سطح پر ٹیکس عاید نہیں۔ اُس نے ٹیکس کی وصولی کو سادہ رکھا۔ صرف پرچون سطح پر سیلز ٹیکس عاید ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ملک انڈونیشیا میں VAT رائج ہے اور کامیاب ہے۔

اصولاً ملک میں درآمد ہونے والی، تیار ہونے والی اور فروخت ہونے والی ہر شے پر سیلز ٹیکس کا نفاذ ہوتا ہے۔ سوا اس کے کہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہو۔ زرعی اجناس، خوراک کی عام اشیا جو پیک نہیں اور بنیادی ادویات مستثنیٰ ہیں۔ برآمدی اشیاء پر ٹیکس نافذ نہیں ہوتا۔ برآمد کنندگان اپنی خریدات پر بھی ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں تا کہ ان کی لاگت کم رہے۔ بعض مقامی سروسز پر صوبائی سیلز ٹیکس عاید ہے۔ مثلاً ہوٹلز، کلیرنگ ایجنٹ اور ٹی وی اشتہارات وغیرہ۔ اس ٹیکس کو وفاقی حکام صوبوں کی جانب سے وصول کرتے ہیں۔ تقریباً 70,000 ادارے سیلز ٹیکس کے گوشوارے داخل کرتے ہیں۔ اگرچہ محکمہ میں رجسٹرڈ اداروں کی تعداد 153,000 ہے۔ گویا رجسٹرڈ اداروں کی اکثریت ٹیکس قواعد پر عملدرآمد نہیں کرتی۔

سیلز ٹیکس کی سٹینڈرڈ شرح 16 فیصد ہے (2008ء سے قبل 15 فیصد تھی)۔ البتہ بعض اشیاء پر ریٹ 18.5 فیصد اور 21 فیصد ہے۔ بعض ماہر سیلز ٹیکس کی شرح پر اعتراض کرتے ہیں، ان کی تجویز ہے کہ یہ شرح گھٹا کر 5 فیصد کے لگ بھگ کر دی جائے۔ اگر حالات جوں کے توں رہیں اور مذکورہ تجویز پر عمل ہو تو سیلز ٹیکس کی مد میں وصول ہونے والی رقم ایک تہائی رہ جائے گی۔ اصولاً شرح کو کم کرنا بہتر ہے مگر یہ ممکن اسی صورت ہے کہ معیشت کی دستاویزی حالت بہتر ہو، حکومت معلومات اکٹھی کرنے کا ایسا نظام قائم کر لے کہ ٹیکس چھپانے والوں کی چوری پکڑی جا سکے۔ سرِدست ہماری حکومت اور ہمارا معاشرہ ایسی اصلاحات کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ اس شرح کو اونچا رکھنے کی ہے۔ سیلز ٹیکس کی بیشتر وصولی امپورٹ کی سطح

پر ہوتی ہے۔ حکومت نے کمرشل درآمد کنندگان پر اضافی 2 فیصد ٹیکس لاگو کر رکھا ہے جسے ویلیو ایڈڈ ٹیکس (Value Added Tax) کا نام دیا ہے۔

2005-06ء کے دوران سیلز ٹیکس کی کل رقم کا 52 فیصد حصہ اندرونِ ملک مصنوعات اور تجارت سے اور 58 فیصد حصہ درآمدی اشیاء پر امپورٹ کی سٹیج پر وصول کیا گیا۔

ہمارے یہاں سیلز ٹیکس کی شرح متعین کرتے وقت صارف کی مالی حالت کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ غریب ملکوں میں ٹیکس کی یکساں شرح (جب اونچی ہو) غیر منصفانہ ہوتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ عوام کے استعمال کی ضروری اشیاء پر سیلز ٹیکس کی شرح کم کی جائے، اور امیر طبقے کے استعمال کی (لگژری اشیا) پر شرح ٹیکس بڑھا دی جائے۔ بہت سے ملکوں نے اس اصول کو اپنایا ہے۔

پرچون فروش معمول کے قواعد کے مطابق سیلز ٹیکس ادا کرنے پر راضی نہ ہوئے چنانچہ حکومت نے پرچون فروش تاجروں کے لیے دوسرا راستہ کھول دیا، یہ کہ فکسڈ شرح کے مطابق ٹیکس اپنی گرہ سے ادا کر دیں۔ اس مسئلہ پر پرچون فروشوں سے متعلقہ باب میں غور ہو چکا۔

چھوٹے صنعت کار، جن کی سالانہ فروخت پچاس لاکھ روپے سے کم ہے، سیلز ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ کئی متوسط درجے کے صنعت کاروں نے اپنے پیداواری یونٹ کاغذوں پر چھوٹے چھوٹے یونٹوں میں تقسیم کر رکھے ہیں۔ اسی طرح بہت سے پرچون فروش جن کی سالانہ فروخت 50 لاکھ روپے سے زیادہ ہے، وہ استثنیٰ کا دعویٰ

کرتے ہیں۔ قانون کا نقص یہ ہے کہ اس نے 50 لاکھ سالانہ سے کم فروخت کے دعویدار چھوٹے صنعت کاروں اور پرچون فروشوں کو حساب کتاب رکھنے سے مستثنیٰ کر رکھا ہے۔ نتیجتاً انہیں یہ دعویٰ کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ ان کی فروخت ٹیکس کے قابل نہیں۔ حال ہی میں غلط دعوؤں کے سدِ باب کی خاطر ایسے صنعت کاروں کے لیے سیلز ٹیکس رجسٹریشن لازمی قرار دے دی گئی ہے، جن کے سالانہ یوٹیلٹی بل سات لاکھ یا اس سے زیادہ ہیں۔

ہمارے یہاں ٹیکس ریونیو کا بڑا حصہ امپورٹ کی سٹیج پر وصول کیا جاتا ہے۔ یہ فریضہ کسٹم کا محکمہ ادا کرتا ہے۔ یہ محکمہ امپورٹ ڈیوٹی تو وصول کرتا ہی ہے مگر ساتھ ہی انکم ٹیکس بھی ایڈوانس وصول کرتا ہے۔ اور جن اشیاء کی درآمد پر ایکسائزڈ ڈیوٹی عاید ہے، اسے بھی وصول کرتا ہے۔ 2007ء میں تمام درآمدی اشیاء پر ایک فیصد کے حساب سے سپیشل ایکسائزڈ ڈیوٹی عاید کی گئی۔ گویا کسٹم حکام درآمدی اشیاء پر پانچ اقسام کے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ امپورٹ ڈیوٹی، انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، ایکسائز ڈیوٹی اور سپیشل ایکسائز ڈیوٹی۔ اس طریقہ کار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بہت سے کاروباری اداروں کے حسابات بھروسے کے قابل نہیں۔

ہماری حکومت کا سیاسی ارادہ کمزور رہا ہے، وہ دستاویزیت پر عمل درآمد نہیں کرا سکی۔ دوسرا طریقۂ کار ڈھونڈ کر ٹیکس وصولی کی راہ ڈھونڈتی ہے مثلاً لوہا ڈھالنے والے کارخانوں سے سیلز ٹیکس وصول کرنے کے لیے پیداوار کا تعین بجلی کی کھپت کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔

حالیہ چند سالوں میں بالواسطہ ٹیکسوں کے نظام میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اوریجنل ایکسائز اور کسٹم قوانین 1947ء سے پہلے انگریز حکمرانوں نے بنائے تھے۔ پرانے قوانین کے مطابق ٹیکس وصولی کے سلسلے میں سرکاری حکام کا براہِ راست عمل دخل ہوتا تھا۔ یوں کہہ لیجیے ٹیکس وصولی کے لیے قانون سازوں کا بھروسا سرکاری عملہ پر تھا۔ سرکاری عملہ اشیا پر ڈیوٹی کارخانے کی حدود سے باہر جانے سے پہلے وصول کرتا تھا۔ اب قانون بدل دیا گیا ہے۔ ٹیکس گزار ڈیوٹی کی ادائیگی مال فروخت ہونے کے بعد سیلز ٹیکس کے ساتھ رضا کارانہ کرتا ہے۔ ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس کا گوشوارہ بھی مشترک ہے۔ گوشوارہ داخل کرنے سے پہلے سرکاری عملہ کی پیشگی منظوری درکار نہیں رہی۔ عملاً سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی کے قواعد میں یکسانیت ہے۔

ایکسائز ڈیوٹی کا وجود سیلز ٹیکس سے الگ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ سیلز ٹیکس کی شرح ملک کی مصنوعات اور درآمدی اشیا پر یکساں رہنی چاہیے۔ یہ عالمی قواعد کا تقاضا ہے۔ چنانچہ جب وفاقی حکومت کو ٹیکس ریونیو بڑھانا مقصود ہو تو وہ اندرونِ ملک پیداوار پر ایکسائز ڈیوٹی نافذ کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی درآمدی شے پر مزید ٹیکس عاید کرنا ہو تو وہ سیلز ٹیکس اور امپورٹ ڈیوٹی کی شرح بڑھانے کی بجائے ایکسائز ڈیوٹی عاید کر دیتی ہے۔

نئے کسٹم قواعد نے نظام کی ہیئت بدل دی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مال کی کلیرنس کے سلسلے میں بہت سے کاغذات پُر کرائے جاتے تھے۔ سرکاری عملہ درآمدی اشیا کی کوالٹی، نوعیت اور مالیت کی تصدیق خود کرتا اور اس کے بعد کسٹم ڈیوٹی وصول

کی جاتی اور مال کلیئر کیا جاتا۔ مگر اب سارا کام آسان کر دیا گیا ہے۔ ڈیوٹی کی ادائیگی سے قبل کسی سرکاری حاکم کی تصدیق اور منظوری درکار نہیں رہی۔ امپورٹر کے اعلان نامہ کے مطابق کسٹم ڈیوٹی، سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی (جہاں نافذ ہو) رضا کارانہ جمع کرائی جاتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر مال کلیر ہو جاتا ہے۔ متعلقہ کاغذات کا آڈٹ کلیرنس کے بعد ہوتا ہے۔ یہ تبدیلیاں آزاد منڈی کی معیشت کے اصولوں سے ہم آہنگ ہیں، ٹیکس گذاروں کو سرکاری عملہ کی مداخلت سے آزاد کیا گیا ہے۔ اس سے رشوت کے مواقع اور شرح کم ہو گئے ہیں، مگر کیا اس طرح سرکاری خزانہ کی آمدن بڑھی۔ اس سوال کا جواب حوصلہ افزا نہیں۔ بظاہر ٹیکس وصولی بڑھی ہے مگر ٹیکس کی قومی پیداوار سے شرح نہیں بڑھی۔

ٹیکس صرف انہی ٹیکس گزاروں سے صحیح اور پورا وصول ہوتا ہے جو اپنی دستاویزات صحیح اور مکمل رکھتے ہیں۔ چنانچہ غیر ملکی کارپوریشنوں اور پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کے علاوہ عام طور پر پورا ٹیکس نہیں ملتا۔ حکومت کے لیے مشکل یہ ہے کہ اگر وہ ٹیکس حکام کا عمل دخل بڑھائے تو عام طور پر اس کا عملہ کرپشن میں ملوث ہو جاتا ہے۔ حکومت اب سرکاری عملے کی مداخلت کم سے کم کرتی جا رہی ہے۔ ٹیکس وصولی اور ٹیکس کٹوتی کے لیے منبع یا مآخذ پر انحصار کیا جاتا ہے۔ حال میں حکومت نے قانونی اختیارات حاصل کیے ہیں کہ وہ جدید آلہ جات مثلاً کیمرہ اور کمپیوٹر کا نظام قائم کرے تاکہ بالواسطہ ٹیکسوں کی چوری کی روک تھام ہو سکے۔ فی الحال شارٹ سرکٹ کیمروں کا استعمال سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی کے لیے نہیں ہوا۔ اگر پاکستان میں

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی ترقی واقع ہو اور انٹرنیٹ کا موثر نظام رائج ہو جائے تو ممکن ہے کہ پراڈکشن اور فروخت کے تمام اندراجات کی نقل ٹیکس حکام کے پاس پہنچ جایا کرے۔ حال ہی میں ٹیکس نظام میں اس نوعیت کی اصلاحات کی گئی ہیں۔ نئے قوائد کی رُو سے گوشوارے، ان میں درج خرید وفروخت کا حساب اور درآمد و برآمد کا سارا ریکارڈ ای فائلنگ کے ذریعے حکومت کو ہر ماہ پہنچ جاتا ہے۔

حکومت نے ایکسپورٹ ریفنڈ کے ذریعے واقع ہونے والے کروڑوں اور اربوں روپے کے فراڈ کی روک تھام بڑی حد تک کر لی ہے، اس سلسلے میں ایک قدم یہ اُٹھایا ہے کہ ایکسپورٹ میں استعمال ہونے والی اشیا کی خریداری پر سیلز ٹیکس کی شرح صفر کر دی ہے نتیجتاً ایکسپورٹروں کی جانب سے ایکسپورٹ ریفنڈ کے کلیم محدود ہو گئے ہیں۔ ٹیکس چوری کے موضوع پر انکم ٹیکس کی بحث میں تفصیلی ذکر آ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں کتاب کے آخری باب میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ٹیکس وصولی کے لیے عوام کا تعاون حاصل کیا جائے۔

ٹیکسوں کے نظام میں ایسی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں کہ ملک کی درآمدات، برآمدات اور پیداوار کا نظام عالمی تجارت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔ تاہم یہ ہم آہنگی ٹیکس کے قوانین تک محدود ہے۔ پاکستان کی معیشت کا پیداواری ڈھانچا بوسیدہ ہے اور اس قابل نہیں کہ اپنی برآمدات میں غیر معمولی اضافہ کر سکے۔ عالمی تجارت سے فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت اس صورت میں پیدا ہوگی جب معاشی ڈھانچہ میں Value Added اشیا کی پیداوار کی صلاحیت پیدا ہو۔ آج پاکستان

عالمی مارکیٹ میں جو اشیا فروخت کرتا ہے وہ پست ٹیکنالوجی کی سستی ہوتی ہیں اور جو اشیا عالمی مارکیٹ سے خریدتا ہے وہ زیادہ دام اور ہائی ٹیکنالوجی کی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فی الحال عالمی معیشت استحصال کا سبب ہے۔ یہ استحصال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک عالمی معیشت کا ڈھانچا منصفانہ خطوط پر استوار نہ ہو۔ مستقبل قریب میں اس کا امکان نہیں، البتہ اگر ہمارے معاشرہ کی ساخت، اس کا سسٹم اور رویے نالج اکانومی کے مطابق بدل جائیں اور تعلیمی نظام جدید خطوط میں ڈھل جائے تو پیداواری ڈھانچے میں ہائی ٹیکنالوجی اختیار کرنے کی صلاحیت بڑھ جائے گی۔ نتیجتاً ہماری قومی پیداوار Value Addition کی حامل اشیاء اور سروسز پیدا کرنے لگے گی۔ اس ماحول میں ہم تیزی سے معاشی اور سماجی ترقی کی منزلیں طے کریں گے۔

بے اعتمادی — ایک بڑا مسئلہ

عام طور پر ٹیکس گزاروں کو ٹیکس کے محکمہ پر اعتماد نہیں اور محکمہ کو ٹیکس گزاروں پر اعتماد نہیں۔ ان حالات میں پاکستان نے ٹیکس وصولی کا متبادل نظام قائم کیا ہے۔ اس نظام میں تجارت پیشہ ٹیکس گزاروں کے حساب کتاب پر انحصار ترک کر دیا گیا ہے۔ ٹیکس وصول کرنے کے لیے ان ذرائع اور ریکارڈ پر اعتماد کیا گیا ہے جن کا تعلق سرکار یا کمپنیوں سے ہے۔ متبادل نظام کی بڑی بڑی خصوصیات کا ذکر پہلے آ چکا مگر یہاں بھی اعادہ کی ضرورت ہے۔

- کارپوریٹ سیکٹر کے سوا کاروباری آمدن پر معمول کا ٹیکس عاید نہیں ہوتا۔ انکم ٹیکس آرڈیننس کے تحت ٹیکس اشیا کی مالیت اور گراس وصولیوں کے حوالہ سے نافذ ہونے لگا ہے۔ قانونی تقاضا پورا کرنے کے لیے اشیا کی مالیت اور گراس وصولی کو ''انکم'' تصور کر لیا گیا ہے۔ اشیائے درآمد اور برآمد کی مالیت پر مفروضہ ٹیکس عاید ہے۔ کنٹریکٹرز اور سپلائرز کی وصولیوں پر بھی یہی ٹیکس نافذ ہے۔
- مکان کا کرایہ وصول کرنے والے، ڈیوڈنڈ وصول کرنے والے، بنک سے سود لینے والے، لمیٹڈ کمپنیوں سے خدمات کا معاوضہ وصول کرنے وا

پیشہ ور افراد، جب کوئی رقم یا آمدن وصول کرتے ہیں تو ادا کرنے والا ادائیگی کے وقت متعین شرح کے مطابق ٹیکس وضع کر لیتا ہے۔ یہ انوکھی بات نہیں، انوکھی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں بہت سی وصولیوں کو ''انکم'' تصور کر لیا گیا ہے۔ اب آمدن کے سب وسائل کی رقوم کو اکٹھا نہیں کیا جاتا بلکہ مفروضہ آمدن کو الگ رکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے ٹیکس کی شرح الگ ہوتی ہے۔

- پرچون فروشوں پر معمول کا قانون نافذ نہیں ہوتا۔ اور اُن سے بکری کی بنیاد پر انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ خرید اور امپورٹ کی سطح پر یا محکمۂ بجلی کو ادا کردہ ٹیکس کا کریڈٹ نہیں دیا جاتا۔
- حساب کتاب کی بنیاد پر انکم ٹیکس ادا کرنے والے کاروباری ادارے لمیٹڈ کمپنیاں ہیں۔ اس سیکٹر میں ٹیکس کی بیشتر ذمہ داری آئل، گیس، بنک اور موبائیل ٹیلی فون کی کمپنیاں اُٹھاتی ہیں۔ تاجروں میں کار اور الیکٹرک اور کچھ دوسری اشیاء بیچنے والے بھی حساب کتاب کی بنیاد پر ٹیکس ادا کرنے کے پابند ہیں۔ سیلز ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی ادا کرنے والے وہی ٹیکس گزار ہیں جو حساب کتاب رکھنے کے پابند ہیں۔ ان کی تعداد 70 ہزار کے لگ بھگ ہے۔

وفاقی ٹیکسوں کا نصف سے زیادہ حصہ امپورٹ کی سطح پر کسٹم حکام وصول کرتے ہیں۔ ٹیکس کا بہت سا بوجھ اُن طبقات پر آن پڑا ہے جو سماجی طور پر کمزور

ہیں۔ یہ ٹیکس اشیاء، بجلی، ٹیلیفون اور متعدد خدمات پر نافذ ہو کر اُن سے وصول کیا جا رہا ہے۔

متبادل انکم ٹیکس نظام میں ٹیکس کی شرح عام طور پر سب طبقات کے لیے یکساں ہے۔ کم آمدن والے ٹیکس گزار اُسی شرح سے ٹیکس ادا کرتے ہیں جس شرح سے امیر ترین طبقات۔ یہ نظام مالدار طبقوں کی مراعات بڑھانے کا سبب بنا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ٹیکس کی شرح کا تعین ٹیکس گزار کی آمدن کی نسبت سے ہو۔ مگر یہ ممکن تب تک نہیں جب تک کہ ٹیکس گزاروں اور محکمہ انکم ٹیکس کے درمیان عدم اعتماد کی فضا موجود ہے۔

اب اس مسئلے پر غور کیا جائے گا کہ اعتماد کی فضا کیسے قائم ہو۔

(1) اس جانب پہلا قدم یہ ہو کہ حساب کتاب رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ متوسط درجے کے تاجروں پر قانونی پابندی عاید کی جائے کہ وہ منظور شدہ آڈیٹر سے اپنے حسابات کا آڈٹ کروائیں۔ فنی نوعیت کے نقائص کا محاسبہ نہ کیا جائے۔ جرمانہ یا سزا کی کارروائی اس صورت میں ہو جب ٹیکس گزار ٹیکس چھپانے کا عادی ہو۔ فی الحال ہماری پہلی توجہ معیشت کی ڈاکومنٹیشن ہونی چاہیے۔ جب تک معیشت ڈاکومنٹ نہ ہوگی، ٹیکس گزاروں کی انفرادی سطح پر کمزوریاں اور نقائص موجود رہیں گے اور ٹیکس گزاروں اور محکمہ کے درمیان چپقلش جاری رہے گی۔

(2) محکمہ کی نچلی سطح پر ٹیکس کا ٹارگٹ حاصل کرنے کا مروجہ طریقہ بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔ وزارتِ خزانہ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے لیے ٹیکس وصول

کرنے کا ٹارگٹ مقرر کرتی ہے۔ بورڈ آف ریونیو ہر ریجن کے لیے ٹارگٹ مقرر کرتا ہے۔ ریجن ہر زونل کمشنر کے لیے یہی کام کرتا ہے۔ زونل کمشنر ہر سرکل کے لیے الگ الگ ٹارگٹ طے کرتا ہے۔ اصرار کیا جاتا ہے کہ بجٹ کا ٹارگٹ پورا ہو۔ سرکل کا افسر بعض ٹیکس گزاروں کی آمدن کی اونچی تشخیص محض اس لیے کرتا ہے کہ اس کا ٹارگٹ پورا ہو۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ وہ ٹیکس کی جو تشخیص کر رہا ہے۔ وہ انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ مجبوری ٹارگٹ پورا کرنے کی ہوتی ہے۔ فیڈرل بیورو آف ریونیو بھی خود کو شکنجے میں محسوس کرتا ہے۔ اُسے طاقتور، ٹیکس چھپانے والے اور مراعات یافتہ افراد کے خلاف کارروائی کی ہمت نہیں۔ جن کیسوں میں محکمہ کو تشخیص کی اجازت ہو، افسر مجاز کئی بار ٹیکس گزاروں پر ناجائز بوجھ ڈال دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ کام بدنیتی پر مبنی ہو۔ ہمارے یہاں ٹیکس کی آمدن یقیناً کم ہے اور ملک بھاری قرضے کے بوجھ تلے ہے۔ ٹیکس بحران کا شیطانی چکر توڑنے کی ضرورت ہے۔ جو اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ مراعات یافتہ طبقات ٹیکس ادا کریں، کاروباری حلقے صحیح حساب کتاب رکھیں، آڈٹ کرنے والے پروفیشنل اقدار کی پاسداری کریں۔ اہم بات یہ ہے کہ تشخیصی افسران کی کارگزاری کا معیار منصفانہ فیصلے ہونا چاہئیں۔ ٹیکس کا نظام انصاف کے جتنے زیادہ تقاضے پورے کرے گا، کامیابی سے اتنا ہمکنار ہوگا۔

(3) ٹیکس کے قانون میں اپیلوں کا نظام بھروسہ کے قابل بنانے کی ضرورت ہے۔ محکمہ کے تشخیصی افسر کے خلاف پہلی اپیل محکمہ ہی کا بالا افسر سنتا ہے جو فیڈرل بیورو آف ریونیو کا اہل کار ہوتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ٹیکس نظام کے سٹرکچر میں اپیل

کے شعبہ کی نئی تعمیر ہو۔ اس میں ہرج نہیں کہ پہلی اپیل اتھارٹی کا افسر مجاز محکمہ سے آئے مگر جب وہ ایک بار اپلیٹ شعبہ اختیار کر لے تو پھر اسی کا مستقل ممبر بن جائے۔ اس شعبے میں داخل ہونے کے بعد اس کی نئی تربیت کی جائے۔ اپلیٹ شعبہ اور اس کے تربیتی ادارے کے نظم ونسق کی ذمہ داری منسٹری آف لا اینڈ جسٹس کے پاس ہونی چاہیے۔ اسی شعبے سے تعلق رکھنے والے افسران کو ٹیکس اپیلیٹ ٹریبونل میں محکمے کا نمائندہ (وکیل) مقرر کیا جائے۔ موجودہ طریق کار میں محکمے کی اپیلوں کی نمائندگی عام افسران کرتے ہیں۔ محکمہ کی صحیح نمائندگی نہیں ہو رہی۔

اپلیٹ شعبہ کا جو افسر ہائی کورٹ کا وکیل یا جج بننا چاہے وہ ایل ایل بی کا امتحان پاس کرے۔ المختصر ٹیکس کے سٹرکچر میں ماہرین کا کیڈر پیدا ہونا چاہیے جو فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے کنٹرول سے آزاد ہو۔ اس سے ٹیکس کے نظام میں بہتری واقع ہوگی۔

ٹیکس نظام معیشت کے نظام کا ایک حصہ ہے۔ معاشی نظام مجموعی معاشرتی، سیاسی اور انتظامی نظام کا حصہ ہوتا ہے۔ ٹیکس نظام میں کوئی ترمیم کیا اثر مرتب کرے گی، اس کا انحصار (i) سماج ومعیشت کی ساخت اور (ii) ریاست کی پالیسی اور اُس کا نظم ونسق چلانے والوں کے طبقاتی مفاد اور اُن کی صلاحیتِ کار پر ہوتا ہے۔ بہتر نتائج کے لیے ضروری ہے کہ ٹیکس نظام کی اصلاح کا کام معیشت، سماج اور انتظامیہ کی اصلاح کی مجموعی سکیم کے حصے کے طور پر کیا جائے۔

ٹیکس وصولی -

بنیادی مسئلے کی نشاندہی

سرسری طور پر پاکستان میں ٹیکسوں کی آمدن بڑھی ہے۔ مگر یہ اضافہ ٹیکس نظام کی کامیابی کا ثبوت نہیں۔ ٹیکس نظام کی کارگزاری جانچنے کا معیار یہ بھی نہیں کہ ٹیکس ریٹ کتنے اونچے ہیں۔ معیار یہ ہوتا ہے کہ وصول شدہ ٹیکس کی رقم کی قومی آمدن سے نسبت کیا ہے۔ اس شرح کا اونچا ہونا ٹیکس نظام کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی یہ شرح 08-2007ء میں 10.1 فیصد تھی۔ بھارت کی شرح 18.8 فیصد تھی۔ ترقی پذیر ممالک کی اوسط شرح 22 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ جو ملک سائنسی اور تیکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوتے ہیں، وہاں یہ شرح 40 تا 50 فیصد ہوتی ہے۔ یہی ممالک اپنے شہریوں کی فلاح سرانجام دیتے ہیں۔ پاکستان میں یہ شرح کم رہ جانے کی متعدد وجوہ ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ہماری معاشی پیداوار کا انحصار پسماندہ علم اور پرانی ٹیکنالوجی پر ہے۔ جبکہ آج کے دور میں تیز رفتار ترقی اور خوشحالی کے لیے جس معیشت کی ضرورت ہے وہ جدید علوم اور ٹیکنالوجی کی اساس پر قائم ہوتی ہے۔ یہ معاملات جدید تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کے دور میں

سماجی اور سائنسی علوم کی ترقی کے ذریعے پیداوار کی ویلیو ایڈیشن ہوتی ہے۔ ویلیو ایڈیشن کی حامل پیداوار ہی زیادہ آمدن اور دولت کماتی ہے اور وہ ہی ٹیکس زیادہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پاکستان میں اگر پیداواری ڈھانچا ترقی پاتے ہوئے ویلیو ایڈیشن کی حامل مصنوعات پیدا اور خدمات فراہم کرے تو حکومت کے ریونیو میں اضافہ ہو جائے۔ ہمارا معاشرہ جب بھرپور انداز سے ترقی کے عمل کا ساتھ دینا شروع کرے گا تب سے تقریباً 25 سال میں معاشی جدیدیت قابلِ ذکر درجہ حاصل کرے گی۔ اس کے لیے پیشگی ضرورت ہے کہ بھارت سے جنگ کا خطرہ دور ہو اور اندرونِ ملک دہشت گردی ختم ہو۔ علمی معیشت (نالج اکانومی) کے فروغ کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ معاشرہ کے علم وفن کی سطح اس قابل ہو کہ وہ نئی تحقیقات اور تکنیک کر سکے۔ کیا ہمارا روایت پرست معاشرہ یہ شرائط پوری کرنے کے قابل ہو سکے گا؟ جواب حاضر ہے کہ ہم تعلیم و تدریس کو جتنا جدید بنائیں گے اُسی قدر ترقی کے امکانات روشن ہوں گے۔ اس جانب لازمی قدم کے طور پر ہمیں فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور کمپیوٹر کی معیاری تعلیم کا بندوبست کرنا ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ٹیکس قوانین کا احترام نہیں۔ اگر احترام ہوتا اور حکومت کو قانون کے مطابق ٹیکس وصول ہوا ہوتا تو بالواسطہ ٹیکسوں پر انحصار بڑھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مثلاً اگر حکومت کو انکم ٹیکس پورا مل گیا ہوتا تو سیلز ٹیکس کی شرح اونچی مقرر کرنے کی نوبت نہ آتی۔ ہمارے یہاں ٹیکس چوری کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ہماری ریاست کو ٹیکس وصول کرنے کا حق نہیں، اس لیے

کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی، اگر اس دلیل کو قبول کر لیا جائے تو ریاست مزید کمزور ہو جائے گی اور انجامِ کار اُس کی کارکردگی مزید گر جائے گی۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے یہاں یہ تناسب بتدریج ہی بڑھ سکتا ہے وہ بھی اس صورت میں کہ معیشت میں جدیدیت کا عمل آگے بڑھے اور معاشرے میں قانون کا احترام قائم ہو۔ ٹیکس وصولی میں ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی ریاست ٹیکس کے قوانین نافذ کرنے کی سیاسی قوتِ ارادہ سے محروم ہے۔ یہ قوت اُسی وقت پیدا ہوگی جب بڑی سیاسی جماعتوں میں ٹیکس وصولی کے لیے قانون کے نفاذ کے معاملہ پر اتفاقِ رائے ہوگا یا بصورتِ دیگر عوام میں ٹیکس قوانین کے احترام کی تحریک شروع ہوگی۔

چوتھی بڑی وجہ یہ ہے کہ زرعی آمدن پر ٹیکس (جو صوبائی ہے) برائے نام ہے۔ کچھ طبقات کو ٹیکس کے نظام میں مراعات حاصل ہیں۔ اس معاملہ کا تعلق ہمارے سماجی سٹرکچر سے ہے۔ طاقتور سماجی طبقات کو ٹیکس کا نظام چھو نہیں سکتا۔ جبکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی آمدن کے اعتبار سے ٹیکس بھی زیادہ ادا کریں۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ملازم پیشہ افراد کی اکثریت مشاہرہ کم ہونے کے سبب ٹیکس کی زد میں نہیں آتی۔ زراعت، روڈ ٹرانسپورٹ، دکانوں اور چھوٹی صنعتوں کے ملازمین کی آمدن ٹیکس ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ چھٹی وجہ ٹیکس گزاروں اور ٹیکس کلیکٹروں کے مابین عدمِ اعتماد ہے۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ کاروبار کی (سوائے کارپوریٹ سیکٹر کے) دستاویزیت ناقص ہوتی جا رہی ہیں۔ آخری دو وجوہ کا باہمی

رشتہ ہے، ان پر اکٹھا غور کریں گے۔

ٹیکس گزاروں کی شکایت ہے کہ ان پر محکمہ کے حکام اعتبار نہیں کرتے، اس لیے وہ صحیح حساب کتاب محکمہ کے سامنے پیش کرنے سے خوفزدہ ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ آج حساب کتاب کے معاملہ میں کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ صنعت کار اور تاجر کو سامان خرید کی رسید نہیں ملتی۔ ہوسکتا ہے مال سمگل شدہ ہو یا اس پر سیلز ٹیکس چھپایا گیا ہو، ایسے مال کی رسید نہیں ہوا کرتی۔ رسید کی غیر موجودگی ایسا نقص ہے جس کی بنیاد پر ٹیکس کلکٹر کو اختیار ہے کہ حسابات کو رد کر دے، عملاً ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ حکومت نے اس صورتِ حال کی اصلاح کی جانب کچھ اقدامات کیے ہیں۔ امپورٹ ڈیوٹیاں کم کی گئی ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس کے نتیجے میں سمگلنگ میں کمی واقع ہوگی۔ جہاں تک سیلز ٹیکس کی چوری کا تعلق ہے، یہ برائی عام ہے۔ جب تک یہ ختم نہیں ہوتی، انکم ٹیکس کی چوری میں کمی واقع نہیں ہوگی۔ گویا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ سیلز ٹیکس کی چوری کیسے رُکے؟ میری رائے میں اکیلی حکومت کی جانب سے سیلز ٹیکس کی چوری روکنے کی کوشش کامیاب نہ ہوگی تاوقتیکہ ٹیکس چوری روکنے کی منظم اور سوچی سمجھی قومی تحریک جاری ہو اور عوام اسے کامیاب بنانے کے لیے کلیدی حصہ نہ لیں۔ اکیلی حکومت اس پوزیشن میں نہیں کہ ٹیکس چوری روکے۔ ٹیکس چوری روکنے کے لیے معیشت کی ڈاکومنٹیشن ہونی چاہیے۔ یہی کام مشکل ہے۔ ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر قانون کا احترام نہیں کرتا۔ ہر طبقہ ایسے کسی قانون کو پسند نہیں کرتا جو اس کے نظریہ یا مفاد کے مطابق نہ ہو۔ بحث ڈاکومنٹیشن تک محدود رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ عام

شہری کو اس سلسلہ میں کلیدی قدم اُٹھانا ہوگا۔ عام صارف جو سامان خریدتا ہے اسے اصرار کرنا ہوگا کہ دکاندار اسے پکی کیش میمو جاری کرے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ دکاندار کو اکثر اوقات تھوک فروش یا صنعت کار سے رسید نہیں ملی ہوتی۔ گویا رسید جاری کرنے کی کڑیاں اوّل تا آخر قائم ہونی چاہئیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ صورتِ حال کی اصلاح کی ابتدا یوں ہو کہ صارفین پرچون فروشوں سے کیش میمو کا مطالبہ کریں جو پرچون فروش انکار کرے اس کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ اس وقت بھی کئی پرچون فروش موجود ہیں جو کیش میمو جاری کرتے ہیں، مثلاً سرکاری یوٹیلٹی سٹور اور بڑے پرچون فروش جو ''کیش ر کیش میمو جاری کرنے کی مشین) کے ذریعے رسید جاری کرتے ہیں۔ صارفین ان سے سامان خریدنا شروع کر دیں۔ اگر ایک بار رسیدات جاری کرنے کا سلسلہ اوّل تا آخر قائم ہو جائے تو انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔

گویا اصل معاملہ عام شہریوں کے شعور کو اُجاگر کرنے کا ہے۔ یہاں ایک سوال اور سامنے آتا ہے۔ صنعت کار اور تاجر بجا طور پر کہتے ہیں کہ بڑے زمیندار، بڑے سیاست دان اور بیوروکریٹ بھی ٹیکس چھپاتے ہیں یا اپنی سماجی طاقت کی بنیاد پر رعایتی ٹیکس کا قانون بنوا لیتے ہیں۔ یہی نہیں اپنے اختیارات کے غلط استعمال اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کر لیتے ہیں، گویا وہ اپنی سماجی ذمہ داریاں ادا کرنے سے گریزاں ہیں۔ اس طرح بات جو صنعت کاروں اور تاجروں کی ٹیکس گریزی سے شروع ہوئی، بڑھتے بڑھتے پورے سماج کی اصلاح تک آن پہنچی۔ اب سوال پیدا

ہوگا کہ یہ اصلاح کرے گا کون؟ اس سے پہلے کہ یہ غور کیا جائے کہ اصلاح کرنے والا کون ہوگا، یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اصلاح کا پروگرام کیا ہو؟ ہم جمہوریت، آئین، نفاذِ اسلام اور زرعی اصلاحات کے نعرے سننے کے عادی ہیں۔ بہت سوں کو تعجب ہوگا اگر میں یہ تجویز دوں کہ ٹیکس نظام کا ریفارم بھی ایک بڑا پروگرام بن سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں رائج ٹیکس نظام ہماری پولیٹیکل اکانومی کا کمزور پہلو ہے، جس کو ہدف بنانا آسان ہے۔ اس کا آغاز ایسا ہونا چاہیے جو عوام کی توجہ کا مرکز بن سکے اور نتائج برآمد کر سکے۔

ٹیکس ریفارم کی ضرورت فلاحی معاشرہ کے قیام کے لیے بھی ہے۔ سرکاری انتظام میں فری تعلیم اور فری علاج کی سہولیات اسی صورت میں ممکن ہیں جب حکومت کے پاس مالی وسائل موجود ہوں۔ اس وقت ٹیکس کی مدوں میں جتنی آمدن وصول ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے اخراجات (جاریہ اور ترقیاتی) تقریباً دُگنا ہیں۔ اس فرق کو حکومت قرض اُٹھا کر یا کرنسی نوٹ چھاپ کر پورا کرتی ہے۔ قرض اُٹھانے اور نوٹ چھاپنے کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ حکومت سماجی خدماتی اور فلاحی فرائض اس وقت ادا کر سکتی ہے، جب اس کے ٹیکسوں کی آمدن بڑھے اور حکومت کی کارگذاری اچھی ہو۔ یہاں میرا خطاب عام صارفین سے ہے۔ جیسے کہ ہم آگاہ ہیں حکومتیں ٹیکس وصولیوں کی شرح بڑھانے میں بار بار ناکام ہو چکی ہیں۔ لیڈر اور بڑے لوگ اس معاملہ میں خاص دلچسپی نہیں لیتے، اُن کی آمدن کے کئی ذرائع ہیں، جائز اور ناجائز۔ ٹیکس کی وصولی میں حکومت کی ناکامی سے انہیں

کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ فائدہ ہوتا ہے۔ ناکامی کے بُرے اثرات زیادہ تر عوام کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ ان کے دن اس وقت پھریں گے جب قومی خزانہ میں اتنی گنجائش پیدا ہو کہ وہ فلاحی خدمات سرانجام دے سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ عوام ٹیکس وصولی میں اضافہ کے لیے کیا کریں؟ وہ ٹیکس ریفارم کی بنیاد پر سماجی اصلاح کی تحریک کا بیڑا اُٹھائیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ٹیکس ریفارم کی تحریک کو غیر سیاسی سطح پر منظم کیا جائے۔ اس کی ابتداء دانشور، سماجی زندگی میں عملی حصہ لینے والے افراد (Activist) اور صارفین کی تنظیمیں مل کر کریں۔ وہ مطالبہ کریں کہ بڑے اور متوسط درجے کے دکاندار اور صنعتکار اشیاء فروخت کرتے وقت کیش میمو جاری کیا کریں۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت بھی مدد کر سکتی ہے، اس طرح کہ وہ کیش میمو کی بنیاد پر لاٹری سسٹم کے اجراء کا بندوبست کرے جس خریدار کی پیش کردہ کیش میمو کی لاٹری نکلے، اُسے انعام دیا جائے۔ یہ نظام کچھ ملکوں میں رائج ہے اور پھر تاجروں اور صنعتکاروں کو بھی یہ ترغیب دی جائے کہ اگر وہ کیش میمو اور بل جاری کریں گے تو انہیں ٹیکس کی ری بیٹ (rebate) دی جائے گی۔ اس تحریک کی کامیابی دُور رس نتائج پیدا کرے گی۔ کالا دھن کنٹرول ہو جائے گا جو حکومت کے لیے گنجائش پیدا کرے گا کہ وہ معیشت کے نظم ونسق کو بہتر بنا سکے۔ میری رائے میں ٹیکس ریفارم کی تحریک کے پنپنے کے امکانات موجود ہیں۔ ابتدائی مشکلات ہر اچھے کام میں پیش آیا کرتی ہیں، اس کام میں بھی پیش آئیں گی۔ اگر ایک بار یہ تحریک چل نکلے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ قوم کو خود اعتمادی بخشے گی اور ریفارم کا دائرہ ایک

شعبہ سے دوسرے شعبے اور اس کے بعد تیسرے شعبے تک وسیع ہو جائے گا۔ یوں اصلاح کا دائرہ پھیلتا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ سماجی خدمت کے جذبہ سے شروع کیا ہوا پروگرام سماجی سیاستدان سامنے لے آئے۔ پاکستان ایسے ترقی پذیر ملک کی ضرورت بھی ایسے سیاستدانوں کی ہے جن کا مقصد اقتدار برائے اقتدار نہ ہو بلکہ اقتدار برائے سماجی خدمت ہو۔

تھاپ پبلیکیشنز کی شائع کردہ کتب

☆ تاریخ کی تلاش	ڈاکٹر مبارک علی	-/225 روپے
☆ تاریخ کی آواز	ڈاکٹر مبارک علی	-/270 روپے
☆ برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ	ڈاکٹر مبارک علی	-/195 روپے
☆ علماء اور سیاست	ڈاکٹر مبارک علی	-/200 روپے
☆ تاریخ کی آگہی	ڈاکٹر مبارک علی	-/250 روپے
☆ تاریخ کے نئے زاویے	ڈاکٹر مبارک علی	-/240 روپے

.....

سہ ماہی

تاریخ

پاکستان کے معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی کی زیرادارت شائع ہونے والا واحد تاریخی مجلّہ، جس میں تاریخ کے مختلف موضوعات پر دنیا بھر سے تاریخ دانوں، مفکروں اور دانشوروں کے فکر انگیز اور معلومات افزاء مضامین کا انتخاب شائع ہوتا ہے۔

اس کا مطالعہ نہ صرف تاریخ کے طلبا بلکہ عام قارئین کے لیے بھی دلچسپ اور فائدہ مند ثابت ہوگا۔ یاد رکھیں دنیا میں صرف وہ قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنی تاریخ محفوظ رکھتی ہیں۔ پاکستان کے موجودہ سیاسی اور معاشرتی حالات میں درست تاریخی حقائق کا علم اب اور بھی زیادہ ضروری ہو چکا ہے۔

مستقل ممبرشپ حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ کریں۔

تھاپ پبلیکیشنز، 43-G، گلبرگ III، لاہور۔

تھاپ پبلیکیشنز کی شائع کردہ کُتب پاکستان بھر میں مندرجہ ذیل بک شاپس پر دستیاب ہیں

یونیورسٹی بک ایجنسی	پشاور	مکتبہ سرحد	پشاور
فقیر کتب خانہ	پشاور	اسلامی کتب خانہ	ایبٹ آباد
عادل سٹیشنری	مانسہرہ	بک سنٹر	راولپنڈی
کتاب گھر	راولپنڈی	اشرف بک ایجنسی	راولپنڈی
مسٹر بک	اسلام آباد	بک فیئر	اسلام آباد
حمید بک سیلرز	مری	مرزا بک ڈپو	دیپال پور
احمد بک سنٹر	قصور	ہیلو بکس	فیصل آباد
کتاب گھر	فیصل آباد	فیاض بک ڈپو	فیصل آباد
الائیڈ بک کمپنی	فیصل آباد	شیخ محمد حسین نیوز ایجنسی	جھنگ
بک سورسز	جھنگ	اقبال بک ڈپو	ٹوبہ ٹیک سنگھ
نیشنل بک سنٹر	گوجرہ	بیکن بکس	ملتان
کاروان بک سنٹر	ملتان	کتاب نگر	ملتان
کتاب مرکز	سکھر	رینبو بک سنٹر	سکھر
الفتح نیوز ایجنسی	سکھر	رابیل کتاب گھر	لاڑکانہ
شاہ لطیف بک سٹور	نوشہرو فیروز	کنول کتاب گھر	مورو
ممتاز کتاب گھر	دادو	سندھ بک کلب	نواب شاہ
جہانگیر بک ڈپو	حیدر آباد	مکتبہ دارالسلام	حیدر آباد
الحبیب نیوز ایجنسی	حیدر آباد	ہلال کتاب گھر	میر پور خاص

سٹی بک پوائنٹ	کراچی	ویلکم بک پورٹ	کراچی
فضلی سنز	کراچی	جہانگیر بک ڈپو	کراچی
ممتاز اینڈ سنز	کراچی	البلال بک سنٹر	کراچی
قلات پبلشر	کوئٹہ	سیل اینڈ سروسز	کوئٹہ
نیو کوئٹہ بک سٹال	کوئٹہ	ہاشمی برادرز	کوئٹہ
بغلانی بک سٹال	کوئٹہ		